ادب اور ثقافت: منتخب اردو ناولوں میں کشمیری ثقافت کے مظاہر میں تنوع کا تجزیہ

مقالہ برائے ایم۔ فل (اردو)

مقالہ نگار

ماریہ خان

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جنوری ۲۰۲۵ء

ادب اور ثقافت: منتخب اردو ناولوں میں کشمیری ثقافت کے مظاہر میں تنوع کا تجزیہ

مقالہ نگار

ماریہ خان

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا ہے۔

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان و ادب)

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جنوری ۲۰۲۵ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے۔ وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: <u>**ادب اور ثقافت: منتخب اردو ناولوں میں کشمیری ثقافت کے مظاہر میں تنوع کا تجزیہ**</u>

پیش کار: ماریہ خان رجسٹریشن نمبر: S23/Urd/M.Phil64

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ اردو زبان و ادب

ڈاکٹر ابو بکر راٹھور ______________________

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی ______________________

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

بریگیڈئیر نادر علی ______________________

ڈائریکٹر جنرل نمل

تاریخ: ______________________

اقرار نامہ

میں ماریہ خان حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے ایم۔ فل اردو سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر ابو بکر راٹھور کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

ماریہ خان

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جنوری ۲۰۲۵ء

فہرست ابواب بندی

عنوان	صفحہ نمبر
مقالے کے دفاع اور منظوری فارم	III
اقرار نامہ	IV
فہرست ابواب	V
ملخص	IX
اظہار تشکر	XI
باب اول: موضوع تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث	**۱**
الف۔ تمہید	
۱. موضوع کا تعارف	۱
۲. بیان مسئلہ	۳
۳. مقاصد تحقیق	۳
۴. تحقیقی سوالات	۳
۵. نظری دائرہ کار	۴
۶. تحقیقی طریق کار	۵

۷. مجوزہ موضوع میں ما قبل تحقیق ۶
۸. تحدید ۶
۹. پس منظری مطالعہ ۷
۱۰. تحقیق کی اہمیت ۷

ب۔ ثقافت: تعارف و بنیادی مباحث

۱. ثقافت: تفہیم و نتائج ۸

ج: کشمیری ثقافت: تعارفی مطالعہ

۱. اردو ناول میں کشمیری ثقافت کے مظاہر: مجموعی جائزہ ۲۲
حوالہ جات ۳۱

باب دوم: منتخب ناولوں میں کشمیری ثقافت کے مظاہر

منتخب اردو ناول "آگ" میں ثقافتی مظاہر ۳۳

الف۔ مناظر فطرت کا مطالعہ: ثقافتی تناظر میں ۳۵
ب۔ جغرافیائی لحاظ سے ثقافتی مظاہر کا تجزیہ ۴۳
۱. بود و باش ۴۶
۲. زبان ۴۹
۳. رسم و رواج ۵۲
۴. کھانے ۵۵

۵. لباس ۵۷

ج۔ اعتقادی اعتبار سے ثقافتی مظاہر کا مطالعہ

ا. مذہب ۵۹

۲. توہمات ۶۱

۳. اساطیر ۶۲

منتخب اردو ناول "برف آشنا پرندے" میں ثقافتی مظاہر ۶۴

الف۔ مناظر فطرت کا مطالعہ: ثقافتی تناظر میں ۶۵

ب۔ جغرافیائی لحاظ سے ثقافتی مظاہر ۷۴

ا. بود و باش ۷۶

۲. زبان ۸۰

۳. رسم و رواج ۸۲

۴. لوک گیت ۸۵

۵. کھانے ۸۶

۶. لباس ۸۸

ج۔ اعتقادی اعتبار سے ثقافتی مظاہر کا مطالعہ

ا. مذہب ۹۰

۲. توہمات ۹۴

۳. اساطیر ۹۵

حوالہ جات ۹۷

باب سوم: منتخب ناولوں میں کشمیری ثقافت کے تنوع کا جائزہ ۱۰۴

الف۔ جغرافیائی لحاظ سے ثقافتی تنوع کا جائزہ ۱۲۱

ب۔ اعتقادی اعتبار سے ثقافتی تنوع کا جائزہ ۱۴۹

حوالہ جات ۱۶۲

باب چہارم: مجموعی جائزہ

مجموعی جائزہ ۱۶۹

تحقیقی نتائج ۱۸۰

سفارشات ۱۸۳

کتابیات ۱۸۴

ABSTRACT

Title: Literature and Culture: An Analysis of Diversity in Manifestation of Kashmir Culture in Selected Urdu Novels.

There is a close connection between literature and culture. Every facet of literature describes culture. The culture of the place is kept in mind when describing it in a novel. Kashmir is well-known throughout the world for both its geography and its culture. To analysis the diversity of Kashmiri culture, two Urdu novels have been chosen. One of these novels is "Ag" written by Azies Ahmed and another novel is " Barf Aahna Prndai" written by Tarnam Ryaz. The elements of Kashmiri culture are depicted in these two novels. The book "Saqafti Basharyat" written by Dr. Muzaffar Hassan Malik was the source of the cultural diversity theory.The qualitative and quantitative research paradigm will be used for this study's purpose. The research would also explore a variety of websites and libraries when gathering data.

There are four chapters in the thesis. The research topic and basic discussion are covered in the first chapter. The elements of culture that are essential to its development are examined. Additionally, this chapter discusses cultural diversity and its components.The second chapter discusses the presentation of Kashmiri culture in these two chosen novels. There are three components to these cultural aspects. The history of Kashmir and its natural features are covered in the first

section. Geographical factors, jewelry, language, customs, food, clothing, and other topics are covered in the second section. The third section discusses the religious aspects of superstition, beliefs, norms, and values.The third chapter discusses the variety of Kashmiri culture as it is depicted in a few chosen novels. This chapter examines the differences between Kashmiri culture in the 20th and 21st centuries and identifies the factors influencing Kashmiri culture in the 21st century. Moreover, the elements that are highlighted in one novel but not in the second are presented by another novelist.The fourth chapter wraps up the entire subject, highlighting both the elements that are new to culture and those that are excluded because of 21st-century technology. The outcome and suggestions are also included in this chapter.

This thesis is unique, which makes it special. This thesis presents a variety of literary works that is affected by cultural diversity. This piece is new due to its distinctiveness.

اظہار تشکر

تشکر کا لفظ ایک خوب صورت احساس پیدا کرتا ہے۔ جو صرف میرے جذبات کی ترجمان ہی نہیں بلکہ سامنے والے انسان کے جذبات کا بھی نمائندہ ہے۔ ابتداء میں اس بابرکت نام کا شکر ادا کرتی ہوں جو زمین اور آسمان کا تنہا مالک اور اس کی وسعتوں کو سمیٹے ہوئے ہے، جس نے مجھے نمل جیسے ادارے تک پہنچایا اور میرا ایم۔فل تک کا سفر مکمل کرنے میں مددگار رہا۔ علاوہ ازیں اس ذات قدس کا مجھ ناچیز پر بڑا کرم ہے جس کی توسط سے یہ دنیا آج بھی قائم و دائم ہے۔ اللہ تعالیٰ اور رسول پاک ﷺ کا شکر ادا کرنے کے بعد میں سب سے زیادہ ممنون اپنے والدین کی ہوں جنھوں نے اس مقام پر پہنچنے میں میرا ساتھ دیا اور ہر مشکل میں میرے ساتھ سائے کی طرح موجود رہے۔ امی اور ابو کے ساتھ میں اپنی بہنوں کی بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے میرا حوصلہ بنائے رکھا اور مقالے کی مشکلات میں ہر لمحہ میرے حوصلے میں اضافہ کیا۔ میں اپنی دادی، دونوں پھپو، دونوں چاچوں ،اپنے خاندان اور اپنے استاد حامد علی کی شکر گزار ہوں جن کی دعاؤں نے میری منزل کو سہل بنایا اور کہیں بھی مجھے تھک کر گرنے نہیں دیا۔ گھر والوں کی مدد کے بغیر یہ کام سرانجام دینا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن عمل تھا۔ جوائنٹ فیملی ہونے کے باوجود میری فیملی نے مجھے پُر سکون ماحول فراہم کیا جس کی بدولت یہ کام مکمل کرنا ممکن ہوا۔

میں اپنے شفیق اور نہایت مخلص استاد ڈاکٹر ابو بکر راٹھور کی شکر گزار ہوں جنھوں نے مقالے کے آغاز سے لے کر اختتام تک میری رہنمائی کی اور ہر مشکل مرحلے میں اپنی ذاتی اوقات سے وقت نکل کر میری مدد کی۔ ان کی رہنمائی اور مفید مشوروں کی وجہ سے آج میں یہ کام مکمل کرنے کے قابل ہوئی ہوں۔ میں اپنے کالج کے پرنسپل سر زاہد اقبال اور ڈائریکیٹر چوہدری خالد محبوب کی بھی ممنون ہوں جنھوں نے تحقیق کے دوران ممکنہ حد تک کالج کے اوقات کار میں مجھے سہولت فراہم کی۔

ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر (صدر شعبہ اردو)ڈاکٹر فوزیہ اسلم،ڈاکٹر عابد سیال،ڈاکٹر نعیم مظہر،ڈاکٹر شفیق انجم،ڈاکٹر صائمہ نذیر،ڈاکٹر بشریٰ پروین،ڈاکٹر محمود الحسن،ڈاکٹر نازیہ یونس،ڈاکٹرنازیہ ملک،ڈاکٹر صنوبر الطاف اورڈاکٹر عثمان غنی سے بے شمار سیکھنے کا موقع ملا۔ جس کے لیے میں بے حد شکر گزرا ہوں۔

میں اپنی اساتذہ میم بنارس، میم بشریٰ، میم روبینہ شہزاد اور میم روبینہ گلراز کی بھی احسان مند ہوں جو وقتاً فوقتاً میری حوصلہ افزائی کرتی رہیں۔ اس کے ساتھ میں اپنے دوستوں عائشہ طالب، سیدہ ثانیہ تصور، محمد رضوان اور انیسہ بتول کی بھی شکر گزار ہوں جو ہر لمحے میرے ساتھ رہے اور اس مشکل مرحلے کو طے کرنے میں میری مدد کی۔ میں اپنی سینئر محمد فاروق کلیار کی بھی احسان مند ہوں جنھوں نے روز اول سے آج تک میری رہنمائی اپنی بہنوں کی طرح فرمائی۔ میں اپنے تمام طالب علموں کی شکر گزار ہوں جو ہر لمحے میرے حوصلے میں اضافے کا باعث بنے۔ جہاں کہیں میری ہمت ٹوٹنے کو آتی وہ میری ہمت باندھے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ مجموعی طور پر میرا ایم۔ فل کا سفر بہت دلچسپ اور یادگار رہا۔ اس سفر میں کئی پڑاؤ دیکھے کچھ سے سبق سیکھا اور کچھ کو سبق سکھایا۔ علم کے نئے زاویوں کو دیکھنے میں اساتذہ اور دوستوں نے مدد کی۔ یہ دور میری زندگی کے حسین ادوار میں شامل ہے۔

ماریہ خان

ادب اور ثقافت: منتخب اردو ناولوں میں کشمیری ثقافت کے مظاہر میں تنوع کا تجزیہ

باب اول:

موضوع تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید

I. موضوع کا تعارف(Introduction):

ناول ڈیڑھ سو سال سے زائد عرصے سے اردو ادب پر چھایا ہوا ہے۔وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ ناول کے مزاج اور اسلوب میں تبدیلی اور ترمیم ہوتی رہی ہے۔ناول ایک وسیع القلب صنف ہے جس میں موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اردو ناول میں دیگر موضوعات کے ساتھ ثقافتی پہلو بھی بہ خوبی بیان کیا گیا ہے۔ ہر ملک اور معاشرے کی اپنی ایک خاص ثقافت ہوتی ہے۔ کسی بھی علاقے کی ثقافت سے مراد اس علاقے کے لوگوں کے رہن سہن کے طریقے، زبان، ذہنی میلانات اور رجحانات ہیں۔ ثقافت کا عمل نسل در نسل منتقل ہوتا ہے۔ فرد معاشرے میں رہ کر ثقافت کو اپناتا ہے۔ ثقافت سماج کے ہر پہلو سے نشوونما اور ارتقا کی حامل ہے۔اس کا اطلاق کھانے پینے، رہنے سہنے، علم وادب، فکروفن، سیاست، فلسفہ، مذہب، اعتقاد اور معیشت وغیرہ پر بھی ہوتا ہے۔

برصغیر پاک وہند کے دیگر علاقوں کی طرح وادیِ کشمیر اپنے دلکش مناظر کے ساتھ ثقافتی مظاہر میں بھی الگ شناخت رکھتی ہے۔ کشمیر کا الگ ریاست کے طور پر مخصوص جغرافیہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ جغرافیائی حدود کے ساتھ ساتھ کشمیر اپنی منفرد ثقافت کے لحاظ سے دنیا کی دوسری ریاستوں سے مختلف ہے۔ عصری تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ثقافت میں بھی کچھ نہ کچھ تغیر و تبدل کا عمل جاری رہتا ہے۔ کشمیر کی ثقافت کا جائزہ لیا جائے تو کئی ایسے عناصر ملتے ہیں جن میں تقسیم برصغیر پاک وہند سے پہلے اور بعد میں تنوع پایا جاتا ہے۔خاص طور سے اکیسویں صدی کے تیزی سے بدلتے منظر نامے میں دنیا کی تمام ثقافتیں متاثر ہوئی ہیں، اسی طرح کشمیری ثقافت پر بھی یہ اثرات بآسانی دیکھے جاسکتے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا

درست ہو گا کہ ثقافت کسی بھی عہد کا عکس یا آئینہ دار ہوتی ہے۔ زیر نظر تحقیق کا بھی مطمع نظر یہی تھا کہ کشمیر میں بدلتے ثقافتی رنگوں کو نہ صرف سامنے لایا جائے بلکہ اس تغیر و تبدل کے محرکات کا بھی احاطہ کیا جائے۔

زیر نظر تحقیق میں کشمیری ثقافتی مظاہر میں تنوعات و تغیرات کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے کے لیے دو اردو ناولوں کا انتخاب کیا گیا تھا۔ اس ضمن میں پہلا منتخب کردہ ناول عزیز احمد کا "آگ" ہے جس کی اولین اشاعت ۱۹۴۶ء میں ہوئی جب کہ جدید اشاعت ۲۰۱۶ء میں الحمد پبلی کیشنز نے کی ہے۔ عزیز احمد کا یہ ناول ۱۹۰۸ء سے ۱۹۴۵ء تک کے عہد کا احاطہ کرتا ہے۔ اس ناول میں ایک ہی خاندان کی تین نسلوں کو بیان کیا گیا ہے جن کا تعلق کشمیر سے ہے۔ ناول میں کشمیر کی روایات، جغرافیہ، تاریخ، خوراک، پکوان، لباس، مذہب اور رسوم و رواج کی بہ خوبی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ کشمیری ثقافت کا نمائندہ ناول ہے جس میں مختلف ثقافتی پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔

جبکہ دوسرا منتخب ناول "برف آشنا پرندے" ترنم ریاض کا ہے، جو ۲۰۰۹ء میں بک کارپوریشن دھلی سے شائع ہوا۔ ناول کشمیر کی زندگی کی ہر پہلو کی عکاسی کرتا ہے۔ کشمیر کے کھانے، رہن سہن کے طریقے، زبان، لباس پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ ناول میں کشمیر کی روزمرہ کی زندگی کے ساتھ ساتھ مذہبی، معاشرتی اور ثقافتی تہواروں کو بیان کیا گیا ہے۔ ناول کی بنیاد کشمیر کی تاریخ اور اس کی خوبصورتی ہے البتہ دوران تاریخ کہیں نہ کہیں سیاسی عناصر نظر آتے ہیں۔ جو اصل موضوع نہیں ہے۔

"آگ" اور "برف آشنا پرندے" دونوں ناولوں میں کشمیری ثقافت کو بیان کیا گیا ہے۔ لیکن دونوں ناولوں میں کشمیری ثقافت کے مظاہر میں تنوعات پائے گئے ہیں۔ وقت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ کشمیری ثقافت کے مظاہر میں بھی تبدیلی رونما ہوتی نظر آتی ہے جنہیں دونوں ناولوں میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ناول "آگ" میں عزیز احمد نے تقسیم سے قبل کے دور کی کشمیری ثقافت اور اس پر اثر انداز ہونے والے عوامل کو دیکھایا ہے جبکہ "برف آشنا پرندے" میں ترنم ریاض نے تقسیم کے بعد اور جدید زندگی کے ثقافتی مظاہر کو قلمبند کیا ہے۔ ثقافت کے ان مظاہر میں مذہب، لباس، تاریخ، جغرافیہ، کھانے، رسومات، اساطیر وغیرہ شامل ہیں جن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ثقافتی تنوعات اور تغیرات کو نشان زد کیا گیا ہے۔ ان تنوعات کی نوعیت، روایتی و نئی صورتوں اور محرکات کو اجاگر کیا گیا ہے۔

II. بیان مسئلہ (Thesis Statement)

ثقافت کسی بھی علاقے یا خطے کی نمایاں پہچان ہوتی ہے۔ ثقافت کے ذریعے ہی ہم مختلف خطوں میں فرق کر سکتے ہیں۔ ثقافت کے بنیادی مظاہر میں لباس، زبان، مذہب، کھانے اور رسومات وغیرہ شامل ہیں۔ چونکہ ثقافت کا براہ راست تعلق معاشرے سے ہوتا ہے اس لیے معاشرے میں رونما ہونے والی تبدیلیاں براہ راست ثقافت پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ دیگر علاقوں کی طرح کشمیر بھی الگ ثقافتی شناخت رکھتا ہے۔ چونکہ کشمیر دو الگ الگ ممالک میں تقسیم شدہ ہے جس کی وجہ سے کشمیر کی ثقافتی صورت حال بھی بدل چکی ہے۔ اس بدلتی صورت حال کا تاریخی اور جدید تناظر میں جائزہ لینا ضروری ہے۔ زیر نظر تحقیق میں بھی کشمیر کے ثقافتی مظاہر کے تنوعات اور ان کے محرکات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں دو ناولوں "آگ" اور "برف آشنا پرندے" کا انتخاب کیا گیا ہے جس میں تقسیم سے قبل اور بعد وجدید ثقافتی مظاہر کے تنوعات اور تغیرات کی صورتحال کو سامنے لایا گیا ہے۔

III. مقاصد تحقیق (Research Objectives):

مجوزہ تحقیق میں درج ذیل مقاصد پیش نظر ہیں:

i. کشمیری ثقافت کی بدلتی صورت حال کے محرکات کا منتخب ناولوں کی مدد سے جائزہ لینا
ii. منتخب ناولوں میں کشمیری ثقافت کے مظاہر کی نشاندہی کرنا۔
iii. منتخب ناولوں میں کشمیری ثقافت کے مظاہر کے تنوعات کا جائزہ لینا۔

IV. تحقیقی سوالات (Research Question):

زیر نظر تحقیق میں درج ذیل تحقیقی سوالات پیش نظر رہیں گے۔

i. ناول "آگ" میں کشمیری ثقافت کے مظاہر کی نوعیت کیا ہے؟
ii. ناول "برف آشنا پرندے" میں کشمیری ثقافت کے مظاہر کے عناصر کو کس طرح پیش کیا گیا ہے؟
iii. منتخب ناولوں میں کشمیری ثقافت کے مظاہر کے تنوعات کی صورت حال کیا ہے؟

.V نظری دائرہ کار(Theoretical Frame work):

مجوزہ تحقیق کا موضوع "ادب اور ثقافت: منتخب اردو ناولوں میں کشمیری ثقافت کے مظاہر میں تنوع کا تجزیہ" ہے۔اس تحقیق میں منتخب اردوناولوں "آگ" اور "برف آشنا پرندے" میں کشمیری ثقافت کے مظاہر میں ہونے والے تنوعات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ثقافت اور کشمیر کی ثقافت کی توضیح و تشریح کے لیے اردو کتب میں حامد کاشمیری کی کتاب "ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب"، صغر اہمایوں میرزا کی کتاب "رہبر کشمیر" ادبی دنیا(کشمیر نمبر)۱۹۶۶ء کے علاوہ انگریزی کتب میں پی۔این۔کے بامزئی کی کتاب "Culture and Political History of Kashmir" اور ڈاکٹر سنلی چندر رے کی کتاب "Early History and Culture of Kashmir" کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ جو ثقافت میں ہونے والی تغیرات کو سمجھنے اور بالخصوص کشمیری ثقافت میں ہونے والے تنوع کو سمجھنے میں مددگار ہیں۔ زیر نظر تحقیقی مقالے میں درج ذیل نکات بالخصوص پیش نظر رہے ہیں:

۱. ثقافت اور ثقافت کی بدلتی صورت حال کے محرکات کا جائزہ لینا۔
۲. کشمیری ثقافت کی روایتی اور جدید صورتوں کو سمجھنا۔
۳. کشمیر کی ثقافت کے تنوعات اور تغیرات کا احاطہ کرنا۔

ہر ملک اور معاشرے کی اپنی ایک خاص ثقافت ہوتی ہے۔ کسی بھی علاقے کی ثقافت سے مراد اس علاقے کے لوگوں کے رہن سہن کے طریقے، ذہنی میلانات اور رجحانات ہیں۔ اگرچہ ہر عہد کی ثقافت دوسرے عہد سے منفرد ہوتی ہے تاہم ان کے درمیان کچھ مشترکہ عناصر بھی ہوتے ہیں مثلاً مذہب، زبان، رسم ورواج اور عائلی زندگی کے عوامل وغیرہ۔ جس کی وجہ سے ایک عہد کی ثقافت دوسرے عہد سے ملتی جلتی نظر آتی ہے لیکن ان خواص کو برتنے کا طریقہ دونوں ادوار میں مختلف ہوتا ہے۔ یہی اختلاف ثقافتی تنوع کہلاتا ہے۔ پروفیسر عبدالحمید کے مطابق "ثقافت کے کسی بھی پہلو میں تبدیلی کو ثقافتی تنوع کہا جاتا ہے۔" ثقافت کے کسی ایک پہلو میں تبدیلی سے ایک عہد کا دوسرے عہد سے تنوع پیدا ہو جاتا ہے۔

ثقافت وقت کے ساتھ نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اس منتقلی کے عمل میں کئی عناصر اس عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جن میں بین الاقوامی اثرات کے ساتھ ساتھ مقامی اثرات بھی شامل ہیں۔ ان اثرات کی زیر اثر ایک

کلچر دوسرے کلچر کی جگہ لے لیتا ہے یا پھر ایک کلچر دوسرے کلچر میں ضم ہو کر نئے کلچر کی صورت اختیار کرتا ہے۔ دنیا میں کشمیر اپنی ثقافت کے لحاظ سے منفرد شناخت رکھتا ہے۔ کشمیری ثقافت پر مختلف ادوار میں کئی عوامل اثر انداز ہوئے ہیں۔ مثلاً تقسیم سے قبل کشمیر الگ ریاست کے طور پر موجود تھا جب کہ تقسیم کے بعد یہ ریاست دو ملکوں میں منقسم ہو گئی اور اس پر دو الگ الگ ملکوں کا اثرات پیدا ہونا شروع ہوئے۔ علاوہ ازیں مقبوضہ کشمیر میں غاصبانہ رویوں نے کشمیری ثقافت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ تقسیم سے قبل کشمیر کی ہاتھ سے بنی ہوئی شالیں اور قالین کو بڑی اہمیت حاصل تھیں جس کا عکس عزیز احمد کے ناول "آگ" میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ موجودہ دور میں ہاتھ سے بنی ہوئی قالین اور شالیں معدوم ہو چکی ہیں اور ان کی جگہ مشین سے تیار کردہ شالوں اور قالینوں نے لے لی ہے۔ یہ صنعت کشمیری ثقافت کا اثاثہ تھی جس کی شہرت عالمی سطح پر تھی۔ لیکن میکانکی نظام نے اس ثقافت کی اصلیت کو ختم کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ پہلے کشمیری زبان میں ہندی کے اثرات زیادہ نظر آتے تھے لیکن دنیا کا گلوبل ویلج بن جانے سے دیگر ثقافتوں کی طرح کشمیری ثقافت پر بھی انگریزی زبان کے اثرات نظر آتے ہیں۔ جس کی عکاسی "برف آشنا پرندے" میں ترنم ریاض نے کی ہے۔

چونکہ کلچر اور ادب کا آپس میں مضبوط تعلق ہوتا ہے، اس۔ لیے کلچر میں ہونے والے تنوع کے اثرات کلچر کے ساتھ ادب میں بھی نظر آتے ہیں۔ اس لیے ایک ہی علاقے یا ریاست کی ثقافت میں تنوع آجانے سے ادب میں اس کی عکاسی میں بھی تنوع آجاتا ہے۔ مجوزہ تحقیق کا موضوع "ادب اور ثقافت: منتخب اردو ناولوں میں کشمیری ثقافت کے مظاہر میں تنوع کا تجزیہ" میں ان تنوعات کے محرکات اور تناظرات کو بہ احسن طریقے سے تحقیقی عمل سے گزار کر نمایاں کیا گیا ہے۔

VI. تحقیقی طریقہ کار (Research Methodology):

مجوزہ تحقیقی مقالے کا عنوان "ادب اور ثقافت: منتخب اردو ناولوں میں کشمیری ثقافت کے مظاہر کے تنوع کا تجزیہ" ہے۔ جس میں منتخب اردو ناولوں میں ثقافتی مظاہر میں تنوعات کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ دورانِ تحقیق تاریخی / دستاویزی طریقہ کار اپنایا گیا ہے۔ بنیادی ماخذات میں دو منتخب ناول "آگ از عزیز احمد" اور "برف آشنا پرندے از ترنم ریاض" شامل ہیں۔ جب کہ ثانوی ماخذات کے حصول کے لیے مختلف کتب خانوں، اخبارات، رسائل و جرائد، علمی

وادبی شخصیات اور ویب گاہوں تک رسائی حاصل کی گئی ہے۔ جہاں سے تحقیقی و تنقیدی کتب، رسائل، مضامین، جامعاتی تحقیقی مقالات اور آن لائن مواد کی جمع آوری کی گئی ہے۔ اس ضمن میں نمل لائبریری، نیشنل لائبریری، ادارہ فروغ برائے قومی زبان، اکادمی ادبیات اور مختلف ویب گاہیں مثلاً گوگل، ریختہ خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

VII. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق(Works already done):

مجوزہ موضوعِ تحقیق پر مختلف نوعیت کا تحقیقی کام ہو چکا ہے جو کسی حد تک کشمیری ثقافت کے تحقیقی کام میں معاون ہیں، البتہ اردو ناول میں کشمیری ثقافت اور اس کے تنوعات کے حوالے سے ابھی تک کوئی کام نہیں ہوا۔ اردو ناول میں کشمیری ثقافت کے مظاہر کے حوالے سے مختلف مقالہ جات سے رہنمائی لی گئی ہے۔

i. اعجاز احمد، اردو ناول میں کشمیر بطور موضوع، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۰۰ء

ii. افتخار مغل، ڈاکٹر، آزاد کشمیر میں اردو کا نثری ادب، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، س۔ن

iii. الطاف حسین ڈار، جدید اردو ناولوں میں ثقافتی تبدیلیوں کی عکاسی، گورونانک دیویونیورسٹی امرتسر ،پنجاب، ۲۰۱۲ء

iv. ممتاز صادق، ڈاکٹر، کشمیر میں اردو نثر کا تحقیقی مطالعہ، سندھ یونیورسٹی جام شورہ، ۲۰۰۰ء

v. محمد عالم چوہدری، ڈاکٹر، تقسیم ہند کے بعد آزاد کشمیر میں اردو زبان کا فروغ، کراچی یونیورسٹی کراچی ، ۲۰۰۳ء

vi. محمد قاسم خان، ڈاکٹر، موضوع کشمیر اور اردو کا افسانوی ادب، سندھ یونیورسٹی جام شورو، ۲۰۰۵ء

VIII. تحدید(Delimitation):

مجوزہ تحقیقی موضوع " ادب اور ثقافت: منتخب اردو ناولوں میں کشمیری ثقافت کے مظاہر میں تنوع کا تجزیہ" ہے۔ مجوزہ موضوع تحقیق کے لیے اردو کے دو ناولوں کا انتخاب کیا گیا ہے، جن میں ایک ناول عزیز احمد کا "آگ" جس کی جدید اشاعت ۲۰۱۶ء میں الحمد پبلی کیشنز نے کی ہے، جبکہ دوسرا ناول " برف آشنا پرندے "ترنم ریاض کا ہے جو ۲۰۰۹ء میں بک کارپوریشن دھلی سے شائع ہوا ہے۔ یہ دونوں ناول بنیادی ماخذ کے طور پر تحقیق کا حصہ ہوں گے۔ متذکرہ

بالاناولوں میں صرف کشمیری ثقافت کے مظاہر پیش نظر رہیں گے جب کہ دیگر موضوعات کو شامل تحقیق نہیں کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں دیگر ناول جن میں کشمیری ثقافت کی عکاسی کی گئی ہے تحقیق کا حصہ نہیں ہیں البتہ دیگر ناولوں پر تحقیقی کام پس منظری مطالعہ کے طور پر پیش نظر رکھا گیا ہے۔

IX. پس منظری مطالعہ(Literature Review):

ناول ایک ایسی صنف ہے جن میں دیگر عناصر کی طرح ثقافت کو بھی مد نظر رکھا جاتا ہے۔ اردو ناول میں بھی مختلف ادوار میں مختلف خطوں، شہروں اور ملکوں کی ثقافت کو بیان کیا گیا ہے یا کسی نہ کسی حوالے سے ثقافتی مظاہر کو پیش کیا جاتا رہا ہے۔ جس کا تجزیہ ناولوں کے تنقیدی مطالعات میں کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب "ادب اور کلچر"، سلیم خان گمی کی کتاب "کشمیر: ادب و ثقافت"، محمد نعیم ورک کی کتاب "اردو ناول کا ثقافتی مطالعہ"، ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب "کلچر کا مسئلہ" اور چراغ حسن حسرت کی کتاب "کشمیر" و دیگر اردو / انگریزی کتب، مقالات وغیرہ پس منظری مطالعہ کے طور پر پیش نظر رہے ہیں۔

X. تحقیق کی اہمیت(Significance of Study):

اردو ناول میں ایک عرصے سے سندی تحقیق ہو رہی ہے۔ ثقافت اور ادب کے درمیانی رشتے کے کئی پہلوؤں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ مجوزہ موضوع پر تحقیقی کام اپنی طرز کا منفرد کام ہے۔ اس سے کشمیری ثقافت کے مظاہر کا مختلف ادوار میں ہونے والے تنوع کو سمجھنے میں مدد ملی ہے۔ معاشرہ اور فرد ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ فرد عہد قدیم سے ہی مسئلہ ارتقاء سے مسلسل گزر رہا ہے جس کے نتیجے. میں ہر آنے والے لمحے میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ یہ تبدیلیاں معاشرے کے رہن سہن اور دیگر عوامل کو اثر انداز کر رہی ہیں۔ انہیں عوامل کی وجہ سے ثقافت کے مظاہر میں بھی عہد بہ عہد تنوع آرہا ہے۔ ثقافتی تنوع سے مراد نئی اقدار، رسم و رواج اور عقائد سے متاثر ہو کر اس کے مطابق ڈھلنے کا عمل ہے جو اسی ثقافت کو دو مختلف عہد میں تقسیم کر دیتی ہے۔ اس کے علاوہ عصری تبدیلیوں کی وجہ سے بھی ثقافت میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔

کلچر کی تشکیل میں کئی عوامل و محرکات عمل اور رد عمل کے طور پر نظر آتے ہیں۔ مذہب، جغرافیائی حالات مخصوص ادوار کے اقتصادی حالات اور سیاسی کوائف یہ وہ چند اہم ترین اور بنیادی عوامل ہیں جو قوم کی ثقافت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ کشمیر کی تاریخ کے مطالعہ سے ایک بات ثابت ہوتی ہے کہ اس علاقے میں کئی قومیں وارد ہوئیں اور ہر قوم اپنے ساتھ اپنا قومی ورثہ بھی لائی۔ یہ ورثہ یہاں کے مقامی کلچر کے ساتھ مل کر ثقافت کی تبدیلی کا سبب بنا۔

ثقافت کا ایک اہم عنصر مذہب ہوتا ہے۔ کشمیری ثقافت میں بدھ مت، سکھ مذہب اور اسلام کے اثرات نظر آتے ہیں۔ ناول "آگ" میں بدھ مت کو کشمیری ثقافت میں دکھایا گیا ہے لیکن عہد کی تبدیلی اور اسلام کی اشاعت کے بعد عہد جدید میں "برف آشنا پرندے" میں اسلام کے اثرات کشمیری ثقافت میں زیادہ دکھائی دیتے ہیں جبکہ دونوں ناولوں میں بدھ مت اور مذہب اسلام پر بات کی گئی ہے۔

ب۔ تعارف اور بنیادی مباحث:

ثقافت: تفہیم و نتائج:

ثقافت عربی زبان کا لفظ ہے۔ ثقافت سے مراد کسی بھی معاشرے کے کھانے پینے، رہنے سہنے، علم وادب، فکر و فن، سیاست، فلسفہ، مذہب، اعتقاد اور معیشت وغیرہ لیا جاتا ہے۔ لفظ ثقافت سہ حرفی مادے "ثقف" پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:

> "بلحاظ مادہ کسی لفظ کے معنی نہایت سادہ ہوتے ہیں۔ لیکن جب وہ لفظ اصطلاح کے طور پر استعمال ہونے لگے تو اس کا مفہوم میں بڑی وسعت پیدا ہو جاتی ہے ثقافت کا عربی سہ حرفی حرف مادہ ثقف ہے جس کے معنی درست کرنا، سنوارنا اور بل نکالنا۔ چنانچہ تیر کو آگ میں تپلا کر سیدھا کرنے کو تثقیف کہتے ہیں۔"(۱)

ثقافت زندگی کی جملہ ضروریات پر بیان کا نام ہے۔ اس بیان میں زندگی کے تصورات، لوگوں سے میل ملاپ اور مذہبی اعتقادات بھی شامل ہیں۔ انفرادی لحاظ سے تو ہر انسان دوسرے انسان سے مختلف زندگی گزرتا ہے لیکن بحیثیت قوم ان کے درمیان کچھ مشترکہ خصائل بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کے لباس میں یکسانیت ہوگی۔ ان کی کھانے اور خوارک میں مطابقت پائی جائے گی۔ ان کی رہائش، طرز مکانات اور رسم ورواج میں مماثلت پائی جائے گی جو اسے دوسری قوم سے ممتاز اور منفرد بناتی ہے۔ کسی بھی قوم کی ثقافت یہ طے کرتی ہے کہ قوم کی طرز زندگی کیا ہوگی ؟ قوم کن عادات واطوار کو اپنائے گی اور کن کو رِد کرے گی ؟ اسی طرح کسی قوم میں کچھ کاموں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے تو کسی دوسرے قوم میں اسے ناپسند کیا جاتا ہے۔ قوم کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کی بنیادی وجہ اس قوم کے عادات و اطوار ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ کلچر کسی علاقے یا معاشرے کے تمام افراد میں ایک جیسا پایا جاتا ہے جس کا اظہار افراد اپنے طرز عمل سے کرتے نظر آتے ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر غلام علی الانا نے ثقافت کی تعریف یوں کی ہے:

ثقافت کے دائرے کے اندر لوگوں کی روزانہ کی زندگی، خوراک، گزر معاش، لباس، رہن سہن کے طریقے، زبان، رسم ورواج، زراعت اور اس کے ذرائع آجاتے ہیں۔ مقامی زبانیں اور بولیاں بھی ثقافت کے مطالعے کے دائرے میں آجاتی ہیں کیونکہ وہ لوگوں کے خیالات، اظہار، سوچ وبچار، تخیل اور ذہنی ارتقا کے مطالعے میں مددگار ہوتی ہیں۔ اس لیے ثقافت ایک طرف انسان کی مادی زندگی کے لیے ضروری اشیا مثلاً اوزار، اسلحہ، لباس اور رہائش وغیرہ سے واسطہ رکھتی ہے اور دوسری طرف غیر مادی یعنی روحانی زندگی سے متعلق چیزوں جیسا کہ زبان، علم وادب، فن ، مذہب، اخلاق اور قانون سے بھی نسبت رکھتی ہے۔"[۲]

انگریزی ادب میں ثقافت کے لیے کلچر کا لفظ بولا اور لکھا جاتا ہے۔ اردو ادب اور تنقید میں ثقافت کے مباحث میں کلچر کی اصطلاح عام طور پر استعمال ہوتی نظر آتی ہے۔ انگریزی میں لفظ کلچر لاطینی لفظ(Cultura) سے ماخوذ ہے۔ جس کے مفاہیم میں سکونت، پذیری، نگہداشت، پرورش اور عبادت گزری ہیں۔ مغربی محققین نے کلچر کی مختلف تعریفیں لکھی ہیں۔ ای۔بی ٹائلر کے مطابق:

"Culture … is that complex whole which includes knowledge, Beliefs art, morals, law, custom and an other capabilities and habits. Its acquired by men as a member of society."(3)

یعنی کلچر گروہی زندگی پر مشتمل ہے اور اس رائے پر کسی نقاد اور ادیب کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مالنوسکی نے کلچر کی سائنسی تشریح کرتے ہوئے یوں تعریف بیان کی ہے:

" It is the integral whole, consisting of implements, and consumer's Goods for the various social groupings, of human ideas and crafts beliefs and customs"(4)

اردو میں کلچر کے معنی ثقافت لیے جاتے ہیں جبکہ کچھ ناقدین نے کلچر کے معنوں میں ثقافت کے ساتھ تہذیب کو بھی لیا ہے۔ فیض احمد فیض نے کلچر کے معنوں میں تہذیب کا لفظ استعمال کیا ہے اور ثقافت کو منفرد چیز قرار دیا ہے جبکہ جمیل جالبی نے ثقافت اور تہذیب دونوں کو کلچر کے معنوں میں لیا ہے۔ ان کے مطابق لفظ کلچر تہذیب اور ثقافت دونوں کو اپنے وسیع معنوں میں استعمال کرتا ہے جبکہ ثقافت اور تہذیب کے معنی محدود اور منفرد ہیں۔ وہ ایک مضمون میں بیان کرتے ہیں:

"آپ کا لفظ "ثقافت" لفظ "کلچر" کے مقابلے میں محدود معنی کا

حامل ہے۔ ثقافت کے لغوی معنی ہیں عربی میں علوم وفنون و ادبیات میں مہارت حاصل کرنا۔ کسی چیز کو تیزی سے سمجھ لینا اوراسی میں مہارت حاصل کرنا، سیدھا کرنا۔ ان معنی کے مزاج پر اگر آپ غور فرمائیں تو محسوس کریں گے کہ یہ لفظ ان چیزوں سے تعلق رکھتاہے جن کا تعلق "ذہن" سے ہے۔ اسی طرح "تہذیب" کے عربی میں لغوی معنی ہیں کسی درخت کو کاٹنا، تراشنا اوراس کی اصطلاح کرنا، سیدھا کرنا۔ فارسی میں بھی یہی معنی ہیں یعنی آراستن و پیراستن، پاک و درست و اصطلاح نمودن، فارسی معنی میں شائستگی، خوش اخلاقی اوراطوار و گفتار و کردار کی شائستگی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ گویا لفظ تہذیب ان چیزوں سے تعلق رکھتاہے جن کا تعلق ہمارے "ظاہر" سے ہے، آپ غور کریں گے تو دیکھیں گے کہ لفظ تہذیب کازور خارجی چیزوں پر ہے ۔ ہمارے طرز عمل کے اس اظہار پر ہے جس میں خوش اخلاقی، اطوار، گفتار اور کردار شامل ہیں اور لفظ "ثقافت" کازور ذہنی صفات پر ہے جن میں علوم وفنون میں مہارت حاصل کرنااور ترقی دینے کی صفات شامل ہیں۔ اسی لیے میں نے تہذیب اور ثقافت کے معنی و مفہوم کو ملاکر "کلچر" استعمال کیاہے "(۵)

مختلف ناقدین کے ہاں کلچر کے مختلف معنی لیے گئے ہیں۔ سر سید احمد خان نے اپنے رسالے "تہذیب اخلاق" میں بھی ثقافت کو کلچر کے معنوں میں لیا ہے۔ اسی طرح احمد ندیم قاسمی، خلیفہ عبد الحکیم نے بھی ثقافت کو کلچر کے معنوں میں لیا ہے۔ پروفیسر کرار حسین کلچر کے متعلق اپنے خیالات کے اظہار اپنی کتاب میں یوں کرتے ہیں:

"کلچر ایک معاشرے کے مخصوص طرزِ زندگی کے اظہار کو کہتے ہیں

۔ یہ اظہار روزمرہ اور میل ملاپ میں بھی ہوتا ہے اور ادب، آرٹ،

فلسفہ اور سائنس میں بھی۔ جاندار کلچر کے لیے ضروری ہے کہ

زندگی میں یقین اور نظر و سرور اور اٹھان کی خصوصیات موجود ہوں۔"[۶]

درج بالا تعریفوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کلچر ایک وسیع اصطلاح ہے جس میں صرف معاشرے کے رہن سہن کے طریقے اور چند لوازمات ہی شامل نہیں بلکہ زندگی کی متعلقہ جملہ ضروریات ہیں جو ایک انسان کے وقتِ پیدائش سے لے کر زندگی کے اختتام تک شامل ہوتی ہیں، سب کلچر کے زمرے میں آتی ہیں۔ ثقافت کی تشکیل و تکمیل اس معاشرے میں موجود لوگوں سے ہوتی ہے۔ معاشرے میں اپنائے جانے والا طرز عمل جس کو مقبولیت عام حاصل ہو یا معاشرے کے زیادہ تر افراد اسے پسند کرتے ہوں آہستہ آہستہ وہ ثقافت کا حصہ بننا شروع ہو جاتا ہے۔ مثلاً کسی معاشرے میں کسی خاص مذہب کو اگر زیادہ اہمیت دی جاتی ہے تو یہ مذہب ثقافت کا حصہ بنے گا۔ ہر ثقافت کے چند مخصوص مقاصد ہوتے ہیں۔ یہ لازم نہیں کہ مختلف ثقافتوں کے یکساں مقاصد ہوں۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے معاشرے مختلف طرز کے تجربات سرانجام دیتے ہیں۔ اس طرح ایک ہی ثقافت میں کئی انواع کے تجربات نظر آتے ہیں وقت کے ساتھ ساتھ یہ تجربات ایک ہی صورت اختیار کرتے جاتے ہیں۔ یہ صورت ثقافت کی ہیئت یا شکل اختیار کرتی ہے۔ ثقافت کی اس شکل کے حوالے سے ڈاکٹر روتھ بیٹی ڈکٹ لکھتے ہیں:

"ثقافت کی یوں کوئی خاص شکل یا ہیئت اختیار کرنے کے عمل کو غیر

اہم اور معمولی سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کل اپنے تمام

اجزا کے محض مجموعے کا نام نہیں ہے، بلکہ اجزا کی ایک ایسی خاص

ترکیب وترتیب کا نتیجہ ہے جس کے باعث ایک بالکل نئی چیز وجود
میں آجاتی ہے۔"(۷)

کسی بھی علاقے کے رسوم ورواج، رہن سہن کے طریقوں کے بارے میں ہو سکتا ہے کہ آپ سب کچھ جانتے ہوں لیکن ثقافتی مقاصد کو نہ جانتے ہوئے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ آپ کو ثقافت کے بارے میں مکمل آگاہی ہے۔ ثقافت میں سے نصب العین کو نکال دیا جائے تو ممکنہ حد تک اس علاقے کی ثقافت کے وجود کے اثرات ختم ہو جائیں گے۔ اس لیے وقت کے ساتھ ساتھ نصب العین میں تبدیلی سے ثقافت میں بھی تبدیلی نظر آتی ہے۔ ثقافت یا کلچر کا ارتقاء زمانے کے لحاظ سے ہوتا رہتا ہے۔ جیمز فریزر لکھتے ہیں "کسی قبیلے یا قوم کی ثقافت کا ایسا استحکام کہ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق برابر ترمیم و تبدیلی ہوتی رہے اور روایت کی بدولت مستقلاً ترقی کرتا رہے۔"(۸) ہر ثقافت نئے دور کے تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھالتی ہے۔ جن میں سے کچھ ثقافتی عناصر زمانے کے ساتھ تبدیلی کا سبب بنتے ہیں جبکہ چند عناصر کی جگہ نئے دوسرے عناصر لیتے ہیں۔ بقول مظفر حسن خان کے ثقافت کی تبدیلی کے دو عوامل ہیں ان میں سے ایک ثقافتی پذیری ہے اور دوسرا عمل انقلاب ہے۔

"یہ (ثقافتی پذیری) عمل بڑی سرعت سے وقوع پذیر ہوتا ہے
اس کے پس منظر میں ایک حاکم قوت ہوتی ہے۔۔۔ انقلاب
معاشرے میں داخلی مسائل کی پیداوار ہوتا ہے اور بغیر خارجی
دخل اندازی کے بھی عمل میں آ سکتا ہے، اس لیے اس میں بھی
عمل تغیر بڑی تیزی سے رونما ہوتا ہے۔"(۹)

ایک نسل سے ثقافت کا دوسری نسل تک منتقل ہونا ایک شعوری اور لاشعوری عمل ہوتا ہے۔ اس عمل کے دوران بزرگ نسل ثقافت کی منتقلی میں سخت حربے بھی استعمال کرتی ہے اور انھیں یہ سکھاتی ہے کہ وہ اپنی مخصوص روایات کو قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ دوسری نسل تک بھی منتقل کریں۔ لیکن موجودہ دور میں ٹیکنالوجی اور ایجادات کے سبب یہ ناممکن عمل ہے کہ وہی رہن سہن اور طرزِ زندگی رکھا جائے جو ایک صدی پہلے موجود تھا۔ نئے ایجادات کی

بدولت خوراک، کھانے پکانے اور مشروبات میں تنوع آ گیا ہے۔ رہن سہن کے طریقے بدل رہے ہیں۔ زبان میں کئی دوسری زبانوں کے الفاظ کا شامل ہونا، رسومات میں دوسرے علاقوں کی رسومات کا داخل ہونا، مکانوں کے طرزِ تعمیر میں نئے طریقوں کا آنا، نقل و عمل کے ذرائع میں تبدیلی آنا اس کی واضح مثال ہے۔ اس کے علاوہ کھیتی باڑی کے طریقوں اور مشینوں کی ایجادات نے اسے ماضی سے مختلف کر دیا ہے۔ صنعتی انقلاب تو اب ماضی کی بات معلوم ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ زندگی کے ہر میدان میں تبدیلی نے ثقافتی تنوع کو جنم دیا۔ یہ ثقافتی تنوع ایک دور کی ثقافت کو دوسرے دور کی ثقافت سے منفرد بناتا ہے۔ ڈاکٹر مظفر حسن ملک لکھتے ہیں:

> "ایک معاشرہ جوں جوں ارتقاء کی منازل طے کرتا ہے ہم اس
> میں معاشرتی مدارج کی بوقلمونی کا مظاہر بھی محسوس کرتے ہیں
> اور معاشرت میں ثقافت کی ترویج کے وہ تمام ذرائع یعنی بزرگوں
> کی طرف سے نئی نسلوں کی ترتیب، درس گاہوں کا فیض اور ذرائع
> ابلاغ کی تبلیغ تمام منابع اپنا اپنا کردار ادا کرنے لگتے ہیں اور یوں
> ایک معاشرے میں متحد ثقافتی اقدار مروج ہوتی ہیں۔ بہر حال
> ہر نسل فنون لطیفہ اور عمومی کردار اپنے لیے خود تعین کرتی ہے۔"[۱۰]

ثقافتی تنوع میں جو عناصر واضح اثر ڈالتے ہیں ان میں نمایاں اعتقادی عناصر ہیں۔ یہ بات ثابت شدہ کہ مذہب ثقافت کے نصب العین اور مقاصد پر اثر انداز ہوتا ہے۔ علاقے کے رہن سہن کے طریقوں سے لے کر کھانے پینے اور شادی بیاہ کی رسوم و رواج تک مذہب کے مطابق ہوتے ہیں اس لیے ثقافت میں مذہب ایک اہم عنصر ہے۔ مذہب امر و نہی کو پرکھنے کا عمومی معیار مہیا کرتا ہے۔ کسی بھی علاقے میں اچھے برے یا اچھائی اور برائی کا تصور مذہب سے ہی منسلک کیا جاتا ہے۔ مذہب میں آسمانی اور زمینی دونوں جہات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ دونوں جہتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن پھر بھی دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ مذہب کی پہلی آسمانی صورت مابعد الطبیعاتی بحثیں ہیں، جو عام طور پر خواص کے لیے مختص ہے جبکہ دوسری صورت تصوف ہے جس کا عام عوام سے تعلق ہے ۔

تصوف سے ہمکنار ہو کر لوگ پیری مریدی کی صورت اختیار کرتے ہیں جس کی انتہاء توہم پرستی کی صورت میں نظر آتی ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

"انسان ہجوم ابتلا میں ان دیکھے خدا کو خود سے بہت دور محسوس
کرتے ہوئے جادو ٹونے اور تعویذ وغیرہ کی صورت میں ایسی
چیزوں کا سہارا اتلاش کرتے ہے جس کا ادراک حاصل کر سکتا
ہے یہی نہیں بلکہ اس صورت میں مذہب کے آسمانی اور زمینی
روپ بھی مل کر یک رنگ ہو جاتے ہیں۔"[11]

ثقافت کا جائزہ لینا مذہبی اعتقادات کے حوالے کے بغیر مکمل ہی نہیں ہے۔جب بھی کسی معاشرے میں کسی معاملے یا مسئلے پر اظہار خیالات ہوتا ہے اس وقت اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے مذہب کا حوالہ دینا لازمی سمجھا جاتا ہے۔انسان کے دنیا میں آنے سے لے کر دنیا سے رخصت ہونے تک کی ہر اہم بات میں مذہب کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔معاشرے سے جڑا ہر انسان اپنی مذہبی اعتقاد کو اہمیت دیتا ہے۔بقول ڈاکٹر مظفر حسن ملک:

"مذہبی عقائد ایک طرح سے ایک معاشرتی تشریط کی صورت
ہیں جسے ہر فرد اپنی رضا، ترغیب یا معاشرتی خیر کے اصول کے
تحت قبول کرتا ہے پھر اس کا یہ پہلو بھی ہے کہ ان اعتقادات کو
معاشرہ مجموعی طور پر قبول کرتا ہے اور توقع رکھتا ہے کہ
معاشرے کے ہم عقیدہ اور ہم مذہب افراد متفقہ دینی اقدار و
معیار سے بغاوت نہیں کریں گے۔مذہب ثقافت کا بدل نہیں
مگر اس کا ایک نہایت اہم پہلو ضرور ہے۔"[12]

یہ بات قابل تسلیم ہے کہ مذہب انسان کی زندگی میں اپنا اختیار قائم رکھتا ہے لیکن میتھیو آرنلڈ نے مذہب کو صرف اخلاقی اقدار تک ہی محدود کیا ہے یعنی مذہبی تعلیمات کا ثقافت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میتھیو آرنلڈ نے اپنی کتاب "کلچر اینڈ انارکی" میں کاملیت پر زیادہ زور دیا ہے۔ تاکہ عقل اور خدا کی حکمرانی قائم ہو سکے۔

"کلچر کی نمایاں صفت "شیرینی اور روشنی" ہیں جن سے وسیع
سطح پر انسانی ہمدردی اور گہرائی فہم پیدا ہوتا ہے۔ کلچر کا مقصد
ہمیشہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ ہمیشہ زندگی کے بہتر مقاصد کی وضاحت
کرے اور ساتھ ساتھ ان مقاصد اور ان کو حاصل کرنے کے
ذرائع میں امتیاز پیدا کرے۔"(۱۳)

کلچر کی تکمیل میں ایک اہم عنصر جغرافیائی صورت حال بھی ہے یعنی دریا، پہاڑ، جنگل، آب و ہوا، موسم الغرض ہر قدرتی چیز جو خارجی ماحول پر اثر انداز ہوتی ہے اس کے زمرے میں آتی ہے۔ اس طرح رہن سہن، خوراک، پوشاک اور مزاج وغیرہ کا بھی علاقے کے لوگوں پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ مثلاً صحرا میں رہنے والوں کی ثقافت اور پہاڑوں میں رہنے والوں کی ثقافت میں فرق پایا جاتا ہے۔

ثقافتی مظاہر میں سب سے اہم عنصر "زبان" کا ہے۔ زبان مختلف انسانوں، گروہوں اور علاقوں میں تعلق قائم کرنے اور اپنے خیالات و احساسات کو دنیا تک پہنچنے اور ان کے خیالات و احساسات کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ اس لیے یہ اہم سمجھا جاتا ہے کہ ایک ہی ثقافت سے تعلق رکھنے والے افراد کی ایک ہی زبان ہو۔ زبان ثقافت کے عناصر کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا بڑا ذریعہ ہے۔ ڈاکٹر مظفر حسن ملک زبان کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ثقافتی جست کے ساتھ بہت زیادہ مربوط زبان ایک نعمت ہے
کیونکہ زبان کا ثقافت کے ساتھ بہت قریبی رشتہ ہے اور زبان
ہی کی وساطت سے سوچ و بچار کا نظام چلتا ہے۔"(۱۴)

ثقافت کی تشکیل، تعمیر اور تنوع میں زبان اہم کردار ادا کرتی ہے۔"ہر ثقافتی زبان کی اپنی اصطلاحات، اپنے محاورات اور مجازات بلاغت ہوتے ہیں۔ لہٰذا کسی ثقافت کو سمجھنا اور پھر اس کی زبان اور لب ولہجہ میں بات کرنا ناگزیر ہے۔"[۱۵] زبان ثقافت کو سمجھنے اور اس کے نظریات یا خیالات کو جاننے کا بڑا منبع ہوتی ہے۔ زبان کے بعد دوسرا بڑا عنصر لباس ہے۔ ہر علاقے کے رہنے والوں کے ملبوسات میں فرق پایا جاتا ہے۔ ثقافت کا نصب العین لباس کا تعین کرتا ہے۔ مغرب کے معاشروں میں جن ملبوسات کو ثقافت کا حصہ بنایا گیا ہے۔ وہ مشرق کے ثقافتی نصب العین سے مختلف ہونے کی وجہ سے مشرق میں کم استعمال کیے جاتے ہیں۔ لباس معاشرے کے اقدار کی عکاسی کرتا ہے۔ لوک گیت اور رسم ورواج بھی ثقافت کو دوسری ثقافتوں سے ممتاز بناتے ہیں۔ ہر علاقے کی کچھ مخصوص رسم ورواج ہوتے ہیں جو ان کے عقیدے اور روایات پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہ رسم ورواج آہستہ آہستہ ثقافت کو حصہ بنتے ہیں۔ کسی بھی رسم کو ثقافت کا حصہ بننے کے لیے سالوں کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ بقول جان ڈیوی:

"فرد کے انفرادی طرز عمل کو تشکیل دینے میں رسوم وروایات
جو حصہ لیتی ہیں وہ اس کی مادری زبان کے پورے ذخیرہ الفاظ
کے برابر ہے۔ اور فرد رسوم وروایات پر جو اثر ڈال سکتا ہے وہ
اس کے مساوی ہے۔۔۔ فرد کی پوری زندگی ہی اول وآخر اُن
سانچوں اور معیاروں سے ہم آہنگ ہونے کا نام ہے جو اس کی
اپنی قوم میں نسل در نسل منتقل ہوتے ہوئے اس تک پہنچتے ہیں۔"[۱۶]

لوک گیت علاقے کی روایات پر مبنی ہوتے ہیں۔ بزرگ یہ روایات سینہ بہ سینہ منتقل کرتے ہیں۔ اردو ادب کے بیش بہا خزانے میں برصغیر کے لوک ورثے کا اپنا ایک خاص مقام موجود ہے۔ دنیا میں تحریر کیے جانے والے ہر متن میں مقامی ثقافت کا اثر نظر آتا ہے جن میں سے ایک عنصر لوک گیت ہے۔ تحریری صورت میں کئی لوک گیت آج بھی ہر زبان میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ وقت میں تنوع کے ساتھ ساتھ رسم ورواج میں تنوع آتا ہے۔ کچھ رسوم وقت کے ساتھ بالکل ختم کردی جاتی ہیں اور ان کی جگہ نئی رسوم اختیار کرلی جاتی ہیں اور کچھ میں ترمیم کی جاتی ہے۔ ثقافت کے اس تنوع کی بڑی وجہ مختلف خطوں کے لوگوں کا میل ملاپ اور مشترکہ طرز زندگی ہے۔ ان باہمی روابط کی وجہ سے ایک خطہ

دوسرے خطے پر اپنے اثرات مرتب کرتا ہے۔ ثقافت کے دیگر عناصر میں سے کھانے اور بودوباش شامل ہیں۔ رہن سہن کے طریقے بھی ہر علاقے کے اپنے ہوتے ہیں۔ ہر علاقے کے لوگوں کی پسند اور ناپسند میں فرق ہوتا ہے۔ کچھ خاص کھانے ہر علاقے کی پہچان ہوتے ہیں۔ جو اس علاقے کے لوگوں کے مزاج کی آگاہی دیتے ہیں۔ نظیر صدیقی ثقافت کے عناصر کا احاطہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ثقافت سے مراد پورا طریقۂ زندگی ہے یعنی ثقافت اس کُل کا نام ہے جس میں مذہب اور عقائد، علوم اور اخلاقیات، معاملات اور معاشرت، فنون وہنر اور رسم ورواج سبھی کچھ شامل ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ثقافت کسی قوم کے ان تمام اصول واقدار، عقائد وضوابط اور اعمال و اطوار کے مجموعے کا نام ہے جن سے کسی قوم کی امتیازی خصوصیات عبارت ہوتی ہے۔"(۱۷)

ہر زندہ ثقافت تنوع کے عمل سے مسلسل گزرتی رہتی ہے۔ ہر ثقافت میں تبدیلی آنا ایک فطری عمل ہے، البتہ کچھ ثقافتوں میں تبدیلی جلد سرایت کر جاتی ہے جبکہ کچھ ثقافتوں میں تبدیلی کا عمل آہستہ اور سست ہوتا ہے۔ ثقافت میں تنوع کی رفتار اور وجوہات کو با آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ ثقافتی تنوع میں کچھ نئے اقدار واطوار کو شعوری طور پر استعمال کرنا اور اس کے مقابلے میں قدیم اطوار واقدار کو شعوری طور پر کم استعمال میں لانا شامل ہے۔ بقول ڈاکٹر مظفر حسن ملک

"کوئی نئی ثقافتی حقیقت، نیا اواز، سامانِ حرب وضرب، الفاظ یا دوسرے افادی عناصر جو عوام کی بہبود کے لیے استعمال کیے جائیں، وہ بہت جلد سندِ قبولیت حاصل کر کے ثقافت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ وہ عنصر بطور واحد کے اپنے مشابہ اور ہم رنگ

عنصر کے ساتھ تبادلے کے لیے مستعمل ہو گا، اس لیے مقابلے

میں بہت کم رکاوٹ پیش آئے گی۔"[۱۸]

ثقافت میں تنوع ہی ایک ثقافت کو دوسری ثقافت سے ممتاز بناتا ہے۔ ثقافت اپنا راستہ خود طے کرتی ہے اور اپنے مخصوص نصب العین اور اسلوب حیات کو زندہ رکھتی ہے۔ جب بھی دو مختلف گروہوں کا آپس میں تقابل کیا جاتا ہے تو اسمیں تنوع کا ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح دو مختلف ادوار میں ایک ہی علاقے کی ثقافت کا موازنہ کرنے میں بھی تنوع پایا جائے گا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ثقافت کے نصب العین میں تبدیلی آتی ہے جو ثقافت میں تبدیلی کا باعث بنتی ہے۔ یہ تبدیلی کبھی بھی اچانک رونما نہیں ہوتی بلکہ اس تبدیلی کو ثقافت میں جگہ بنانے یا لوگوں کو اپنانے کے لیے بھی وقت درکار ہوتا ہے۔ ثقافت فرد اور گروہوں کے درمیان اتحاد اور افتراق دونوں کا باعث ہو سکتی ہے۔ اگر فرد اور گروہوں ایک ہی نظام پر رضامند ہے تو اتحاد قائم رہتا ہے نہیں تو ثقافت میں افتراق ہونے سے ثقافت کے عناصر میں تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے۔ بعض اوقات ملک کی معاشی وسیاسی تبدیلیاں، نئی ایجادات یا ذرائع میں اضافے بھی ثقافت میں تنوع کا باعث بنتے ہیں۔ بعض ثقافتی تبدیلیاں ایجادات کی مرہون منت ہوتی ہیں۔

درج بالا باتوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ثقافت کسی بھی معاشرے کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ کسی بھی معاشرے کو سمجھنے اور جاننے کے لیے اس کی ثقافت کا علم ہونا بہت ضروری ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے ثقافت کے لیے تین شرائط کو ضروری قرار دیا ہے۔

۱. اول عضوی حس یعنی تشکیل و تعمیر کا ہونا ضروری ہے۔
۲. جغرافیائی ماحول کے مطابق بطور مقامی ثقافت کے قابل تجزیہ ہو۔
۳. مذہبی اتحاد اور بو قلمونی ہو۔ جس میں مذہب کی عالمگیر حیثیت، تعلیم اور طریقہ ہائے عبادت ہو۔

ثقافت کے ارتقاء میں یہ تینوں شرائط ہونا ضروری ہے۔ جغرافیائی ماحول، مذہب، تعلیم معاشرے کے اہم عناصر ہیں جن کے بغیر معاشرے کی تکمیل نامکمل ہے۔ ثقافت چونکہ معاشرے کی آئینہ دار ہے اس لیے ثقافت کے لیے بھی ان کا ہونا لازم و ملزوم ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے ثقافت کا انحصار فرد کی بجائے معاشرے کو قرار دیا ہے۔ اس لیے معاشرے کے

اجتماعی عقائد اور ماحول نسل در نسل منتقل ہوتے ہیں تو ان شرائط کی بنیاد پر نئی نسل ان کی شناخت کرے گی۔ڈاکٹر مظفر حسن ملک ٹی ایس ایلیٹ کے اس نظریے پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ثقافت ایک معاشرے کی اکتسابی اہلیت ہے، جو کہ افراد کو
معاشرے کی طرف سے منتقل ہوتی ہے۔اس میں روایات،
اسلوب حیات، انداز فکر، احساس اور کردار سب متعین
ہوتے ہیں۔اس میں علم، عقائد، آرٹ، اخلاقیات، قانون،
رسوم و روایات اور وہ عادات جو معاشرے کے زیر اثر افراد
حاصل کرتے ہیں۔ تمام شامل ہوتی ہیں۔"[۱۹]

کلچر میں بڑی وسعت و گہرائی پائی جاتی ہے۔ ثقافت انسانی پوری زندگی پر حاوی ہوتی ہے۔ انسان کی نشوونما ،ارتقاء، زندگی کے اختتام تک کے عوام ثقافت سے منسلک ہیں۔ یہ ہی نہیں بلکہ دوسروں سے تعلقات قائم رکھنے، معاشرے میں نظم وضبط قائم کرنے، سماجی سرگرمیوں میں حصہ لیناوغیرہ بھی ثقافت ہی طے کرتی ہے۔اس لیے ثقافت کا اپنا منفرد نصب العین ہوتا ہے۔ ثقافت عہد کی ہمہ جہت آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی روایات اور تاریخ کی بھی عکاس بنتی ہے۔

فرد جس معاشرے میں رہتا ہے اس معاشرے کی ثقافت کو اپنانا اس کا فرض ہوتا ہے۔ ہر نسل اپنی آنے والی نسل کو ثقافت منتقل کرتی ہے۔ ثقافت کی اس منتقلی کے عمل میں کئی تبدیلیاں رونما ہوتی ہے۔ ہر دور کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔اس لیے ہر نسل دوسری نسل سے مختلف ہوتی ہے۔ ثقافت کی تبدیلیوں میں مقامی عناصر کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ ثقافت پورے معاشرے پر مبنی ہوتی ہے اس لیے فردِ واحد کے لیے اس کو بدلنا ناممکن ہے۔ معاشرے کے ایک حصے کا اس عمل میں شامل ہونا ضروری ہوتا ہے۔ عہد بہ عہد ثقافت میں تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے۔"کسی قوم کی تہذیب یعنی انسان کے اپنے بنائے ہوئے ماحول میں اصلاح و ترمیم کا عمل جو کبھی ارادی ہوتا ہے اور کبھی غیر ارادی ہوتا ہے۔"[۲۰] ثقافتی تبدیلیاں کبھی کبھار مثبت ثابت ہوتی ہیں اور کبھی کبھار منفی ثابت ہوتی ہے۔

ثقافت میں سب سے زیادہ اہمیت مذہب کو حاصل ہے۔ مذہب کسی بھی معاشرے کی بنیاد ہوتا ہے۔ مذہب کے اصول وضوابط معاشرے کے رہن سہن کو طے کرتے ہیں۔ معاشرہ اپنی حدود کو مذہب کے حدود کے اندر رہ کر طے کرتا ہے۔ ثقافت کا امتیازی نشان یہ ہے کہ اس میں حصول علم کا سائنٹفک جذبہ اور نفع رسانی کا جذبہ دونوں شامل ہیں۔" آدرشی تصور کے مطابق ثقافت ایک آزاد اور خود مختار روح اور ذہن کا ماحصل ہے۔"(۲۱) انسانی عقل رضائے الٰہی کے قابل قدر تصورات کا مطالبہ کرتی ہے۔ تمام علوم کا ایک بات پر اتفاق ہے کہ خدا کی حکمرانی انسان کے دل و دماغ پر ہوتی ہے۔ انسان کی نشوونما میں دل و دماغ ہی حصہ لیتے ہیں۔ اس لیے مذہب اور ثقافت آپس میں لازم وملزوم ہیں۔

"مذہب جو انسان کی ان کوششوں میں جن کے ذریعے بنی نوع انسان نے خود کو کامل بنانے کے جذبے کا اظہار کیا ہے، سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ عظیم کوشش ہے۔ لہٰذا مذہب اور ثقافت دونوں ایک ہی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔"(۲۲)

ثقافت میں مذہب کے بعد رہن سہن، لباس اور زبان کو اہمیت دی جاتی ہے، اگر دیکھا جائے تو عموماً ثقافت کے معنوں میں رہن سہن، لباس اور زبان کو ہی لیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ عناصر ہے جو معاشرے میں بظاہر نظر آتے ہیں۔ ثقافت کا نصب العین لباس کے معیار کو طے کرتا ہے۔ ہر ثقافت کے کچھ مقاصد ہوتے ہیں جو وہاں کے لوگوں کے ذہنی میلان کو مد نظر رکھتے ہوئے ترتیب دیے جاتے ہیں۔ اس لیے ہر معاشرہ ان مقاصد کو فرد کی ذاتی سوچ یا نظریے پر زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ فیض لکھتے ہیں:

"کلچر کی اثراندازی ذہنی طور سے بھی ہوتی ہے، عقائد واقدار کے ذریعے بھی، عملی طور سے بھی، زندگی کے آداب ورسوم سے اور زندگی کے روزمرہ کا جو محاورہ ہے، اس کے ذریعے سے بھی۔ اس میں اجتماعی زندگی کی ظاہری اور باطنی تفاصیل دونوں شامل ہوتی ہیں۔"(۲۳)

زبان کسی بھی معاشرے میں روابط قائم کرنے کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔ جب تک انسان کے پاس اپنے خیالات کا ذریعہ موجود نہ ہو وہ معاشرے سے روابط قائم نہیں کر سکتا ہے۔ معاشرے سے روابط قائم رکھنے اور جذبات واحساسات کے اظہار کے لیے زبان ضروری ہے۔

کسی دور یا عہد میں ثقافت کے جدید عوامل میں سے بعض عوامل ایجادات کے مرہون منت ہوتے ہیں یا کسی دوسری ثقافت سے روابط کے عمل اکتساب کی بدولت عمل میں آتے ہیں۔ عوامل ہمیشہ یا تو گروہ کے اندر ہی تشکیل دیئے جاتے ہیں یا دوسروں سے بذریعہ اکتسابی عمل سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ ثقافت کا کوئی بھی حصہ جبلی نہیں ہوتا اور اسی طرح ارثیاتی طور پر بھی ثقافت کا کوئی حصہ منتقل نہیں ہوتا۔ ثقافت کا آغاز معاشرتی عمل سے ہوتا ہے اور اسے تقویت انسانی ضروریات ، اختیارجات اور آرزوں کے رد عمل کے طور پر ملتی ہے۔ ضروریات اور اذہان میں مشابہت اور مماثلت کرہ ارض کے مختلف خطوں میں یکساں ایجادات واختراعات کا باعث بنتی ہیں۔ بعض دفعہ یہ اختراعات حادثاتی طور پر بھی ہوتے ہیں۔ حادثات کے علاوہ بعض ایسے مواقع شامل ہوتے ہیں جن کی بدولت کوئی نئی چیز وجود میں آجاتی ہے۔ اس طرح ثقافت میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ یہ ثقافتی تبدیلی ہی ایک عہد کی ثقافت کو دوسرے عہد کی ثقافت سے متنوع بناتی ہے۔ جدید دور میں ثقافتی تنوع کی بڑی وجہ لازماً سائنس ہے۔

"جب کبھی کوئی ایجاد یا اختراع عمل میں آجاتی ہے تو وہ دور و
نزدیک پھیل جاتی ہے۔ نقل اور تقلید ایجاد کے مقابلے میں
آسان عمل ہے۔ ایک مخصوص گروہ کے اندر زیادہ تر اختراعی
ثقافت بیرونی اثرات ہی کے تحت داخل ہوتی ہے۔"(۲۴)

جدید دور میں ثقافتی تبدیلی کی بڑی وجہ اکیسوی صدی ہے۔ اکیسوی صدی ٹیکنالوجی کی صدی کہلاتی ہے۔ اس صدی نے دنیا کی تمام ثقافتوں کو متاثر کیا ہے۔ پہلے جو کام ہاتھ سے کیا جاتا تھا ان کی جگہ اب مشینوں نے لے لی ہے۔ ٹیکنالوجی نے پوری دنیا کو گوبل ویلیج بنادیا ہے۔ گوبل ویلیج سے اب دنیا کی مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کا ملاپ نظر آتا ہے۔ ثقافتوں کے اس ملاپ نے ثقافتوں میں تنوع پیدا کیا ہے۔ ادب چونکہ معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ جب ثقافت میں تبدیلی رونما ہو گی تو ادب میں بھی تبدیلی نظر آئی گی۔ اسی وجہ سے ثقافتی تنوع ادب میں بھی تنوع کا باعث بنتا ہے۔

ج: کشمیری ثقافت: تعارفی مطالعہ

الف۔ اردو ناول میں کشمیری ثقافت کے مظاہر: مجموعی جائزہ

کسی بھی قوم کی ثقافتی، نظریاتی، تہذیبی بنیادوں کا جائزہ لینا ہو تو وہاں کے ادب کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ ادب اہم نتائج کے حصول اور قوم کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔ کشمیر کے موضوع پر بات کی جائے تو اردو ادب کی ہر صنف میں کشمیر پر بات کی گئی ہے۔ شاعری، افسانوں میں کشمیری ثقافت کی عکاسی کے لیے اشاراتی انداز اپنایا گیا ہے جبکہ اردو ناول میں کشمیر کو بطور موضوع تفصیلاً لکھا گیا ہے۔ ناول ایک ایسی صنف ہے جس میں کینوس اتنا وسیع پایا جاتا ہے کہ کسی قوم کے ماضی، حال اور مستقبل کا احاطہ کرنا ممکن ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ کشمیر پر لکھے جانے والے ناول ایک ہی علاقے میں ہونے کے باوجود ان میں تنوع پایا جاتا ہے۔

ان ناولوں میں کشمیری ثقافت کی بھرپور عکاسی نظر آتی ہے۔ کشمیری ثقافت کو دنیا کی ثقافتوں میں منفرد ثقافت سمجھا جاتا ہے۔ ان ناولوں میں کشمیری رہن سہن، ان کا لباس، ان کے رسوم نظر آتے ہیں۔ خطے کی دلکشی سے شروع ہو کر کشمیر کی تہذیب و ثقافت اور کشمیر کی تاریخ تک ہر موضوع سے ناول ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ مقالے کے منتخب ناولوں کے علاوہ بھی اردو ناولوں میں کشمیری ثقافت کے مظاہر نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

I. پرانا قالین:

"پرانا قالین" ابو سعید قریشی نے ستمبر ۱۹۸۹ء میں نفیس اکیڈمی سے شائع کیا۔ یہ ناول ۱۹۴۷ء کے زمانے کے حالات کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔ پورا ناول کشمیر کے ایک قالین فروش کے گرد گھومتا نظر آتا ہے۔ جس کی مدد سے ناول میں کشمیر کی معاشرت اور سیاست کے ایک خاص دور کی عکاسی کی گئی ہے۔ ابو سعید قریشی نے بڑی مہارت کے ساتھ کشمیر کے حسن کی عکاسی کی ہے۔ کشمیر پر لکھے گئے ناولوں میں ثقافتی عناصر علامتوں کی صورت اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں قالین کو ثقافتی علامت کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ قالین خوشحالی اور امارت کی علامت ہے جس اعلیٰ اور فارغ البال طبقہ استعمال کرتا ہے لیکن وہ لوگ جو اس قالین کو بناتے ہیں ان کا اس پر کوئی حق نہیں ہے۔

ناول میں بنیادی اہمیت ایسے خاندان کو دی گئی ہے جس نے قالین بافی کو بطور پیشہ اختیار کیا ہوا ہے۔ "عبد الصمد" جو کہانی کا مرکزی کردار ایک قالین فروش ہے۔ عبد الصمد کا دادا عبد الرحمٰن قالین بافی کا کام کرتا ہے ۔عبد الصمد کو پیسے سے زیادہ محبت ہے اسی وجہ سے وہ اپنی بیٹیوں کی شادی بھی نہیں کرتا اور اس کی بیوی بھی اس کے ظلم کا شکار نظر آتی ہے۔ ناول کے آغاز میں ہی سعید قریشی قاری کو اپنے سحر میں مبتلا کرلیتا ہے جس کا سحر ناول کے اختتام تک قائم رہتا ہے۔ جب وہ ناول میں مرکزی کردار عبد الصمد کا تعارف کرواتا ہے تو ایک پرانے قالین پر بیٹھا اپنے ماضی کی راکھ کرید رہا ہوتا ہے۔ "اس کی انگلیاں کپکپائیں۔ ہاتھوں کے لمس اور بازوؤں کی حدت سے پرانا قالین آنچ سی دینے لگا۔ "نقش خزاں" زندہ ہو گیا۔"(۲۵) ناول کا اسلوب جاندار ہے۔ ناول میں کئی مقامات پر استعمال ہونے والی تشبیہات و استعارات ناول میں جان ڈال دیتے ہیں۔ کشمیر کے حسن کو بیان کرتے ہوئے استعمال ہونے والی تشبیہات کچھ یوں ہیں:

"ساری وادی پر ایک سفید چادر پھیلی ہوئی ہے اور چاروں طرف
پہاڑوں کی قناتیں اور برف پوش چیڑوں، چناروں، دیواروں اور
سفیدوں کے خیمے چمک رہے ہیں۔ فوج محاصرہ کئے پڑی ہو جس
طرح۔ اور وادی جھونپڑوں اور ڈونگوں میں امیروں کے لئے دو
شالے اور قالین بُننے والی "چرب دست وتر دماغ" مظلوم قوم
فاقوں اور سردی کی شدت کو کم کرنے کے لئے بیٹ سے کانگڑی
لگائے آنے والے موسم کے سیاحوں کے لیے حسن کاری میں
مصروف ہے۔"(۲۶)

اس طرح ایک اور جگہ ناول میں کشمیری ثقافت میں نمایاں حیثیت رکھنے والے قالینوں اور دست کاری کے بارے میں ابو سعید قریشی لکھتے ہیں:

"قالین کی پیشانی پہ خط کوفی میں "نقش خزاں" کا عنوان حاشیے
کے تانے بانے سے کچھ ایسا ہم آہنگ ہوا تھا جیسے ڈوبتے ہوئے

سورج کا انگاروں و چناروں کے جھنڈ میں جلتی سلگتی، بجھتی ٹہنیاں

چھوڑ گیا تھا۔"(۲۷)

الغرض کشمیر پر عنوان پر لکھے جانے والا ناول کشمیر کی ثقافت کی بھرپور عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔

II. ڈاک بنگلہ:

اے حمید کا ناول "ڈاک بنگلہ "۱۹۶۴ء میں خالد بک ڈپو سے شائع ہوا ہے۔ اس ناول میں کشمیر کی وادی چندن پور کا ذکر ہے۔ یہ ڈاک بنگلہ چناروں کے اونچے، لمبے درختوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس ناول کی پوری کہانی "زیتون" نامی لڑکی کے گرد گھومتی ہے جسے اکبر علی نامی شخص سے محبت ہو جاتی ہے جو ڈاک بنگلہ میں رہتا ہے۔ اکبر علی کسی مجبوری کے تحت شہر میں منتقل ہوتا ہے اور "زیتون" جو کہانی میں بطور ہیروین اپنا کردار ادا کر رہی ہے، اپنی زندگی اکبر علی کے انتظار میں صرف کرتی ہے اور اپنی شادی والے دن بنگلے سے واپس جاتے ہوئے کھائی میں گر کر مر جاتی ہے۔

ناول کی کہانی اپنی روایتی انداز میں پائی گئی ہے لیکن مصنف نے اس میں ڈاک بنگلے کو شامل کر کے کشمیری حسن کو ناول میں شامل کر دیا ہے۔ڈاک بنگلہ کشمیر رومانیت کی عکاسی کرتا ہے۔ اے حمید نے کہانی میں کشمیر کے خوبصورت مناظر کو بیان کر کے اس کہانی کے تاثر میں اضافہ کر دیا ہے۔

"چندن پور کی وادی سلسلہ ہائے کہسار کشمیر کے شمال مشرقی
دامن میں واقع ہے۔ ساری کی ساری وادی سطح سمندر سے
پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔ یہاں چناروں کے اونچے،
لمبے گھنے درختوں کے گنجان جھنڈ ہیں اور ڈھلانوں پر چیڑھ
کی قطاریں نیچے سے اوپر تک چلی گئی ہیں۔ شمال کی جانب کشمیر
کی بلند پہاڑیوں پر برف سارا سال جمی رہتی ہے۔ صبح کو جب
سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کی کندنی چمک سے ان پہاڑوں پر

برف کا رنگ سرخ ہو جاتا اور ساری وادی میں دہکتے ہوئے

سونے کا غبار پھیل جاتا ہے۔"(۲۸)

III. اور چنار جلتے رہے:

"اور چنار جلتے رہے" اے حمید کا ناول ہے جو ۱۹۹۱ء میں سنگ میل پبلی کیشنز نے لاہور سے شائع کیا ہے۔ یہ ناول ۱۹۶۵ء کی جنگ کے حالات کے گرد گھومتا ہے۔ اس ناول میں ۱۹۶۵ء کی جنگ کے فضائی حالات کو بیان کیا گیا ہے۔ ناول واحد متکلم کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ ناول میں مصنف نے ماضی کے واقعات کو حال کے ساتھ جوڑا ہے۔ ناول میں چار مختلف واقعات کو آپس میں جوڑا گیا ہے۔ واقعات کی عکاسی کے دوران اے حمید نے کشمیری خوبصورتی اور لینڈ سکیپ کو بیان کرتے ہوئے قدرتی مناظر کی تصویر کشی پہاڑی علاقوں اور چنار کے درختوں کے حوالے سے کی ہے۔

"پہاڑی راستہ دشوار گزار ہوتا جا رہا تھا۔ کوئی باقاعدہ پگڈنڈی

وہاں نہیں تھی انہیں جھاڑیوں میں سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔

کئی جگہوں پر جھاڑیوں کو چاقو سے کاٹ کر راستہ بنانا پڑا۔

دن ڈوبنے تک وہ چٹانی علاقے میں آ گئے۔ یہاں ٹیلے بھی

تھے اور سرمئی رنگ کی بے آب و یار چٹانیں بھی زمین

سے سر نکالے کھڑی تھیں۔"(۲۹)

مصنف نے قدرتی مناظر کے ساتھ ساتھ کشمیر کے لوگوں کے رسم و رواج اور معاشرت کی تصویر کشی بھی کی ہے۔ جس سے کشمیر کی تہذیبی زندگی ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ غفار گائیڈ جب رب نواز اور علی رضا کے لئے ناشتہ لاتا ہے تو اس موقع پر مصنف نے ناشتہ کے مشمولات کا ذکر کرتے ہوئے کشمیری معاشرت کا بیان کیا ہے:

"غفار گائیڈ دن نکل چکا تھا جب آیا۔ اتنی دیر میں رب نواز

اور علی رضا کونے میں رکھے پانی کے مٹکے سے منہ ہاتھ دھو کر

> تازہ دم ہو چکے تھے۔ کشمیری گائیڈ اپنے ساتھ ایک گدھا بھی لایا تھا جس پر سوکھی لکڑیاں لدی ہوئی تھیں۔ ہاتھ میں رومال میں بندھا ہوا ناشتہ تھا اور بغل میں ایک گٹھڑی تھی۔ ناشتے میں وہ کشمیری سبز چائے کی دیگچی، روٹیاں اور اچار لایا تھا۔"(۳۰)

مصنف نے جنگ کے پس منظر میں کشمیری ثقافت کی عکاسی کی ہے۔ جنگ میں ہونے والے نقصانات اور جنگ کے بعد کے حالات ناول کا بنیادی موضوع تھا۔

IV. میری یادوں کے چنار:

"میری یادوں کے چنار" کرشن چندر کا سوانحی ناول ہے۔ جو ۱۹۶۲ء میں ادارہ فروغ اردو لاہور سے شائع ہوا۔ اس ناول میں کرشن چندر نے اپنے بچپن کی یادوں اور کشمیر میں گزرے ہوئے وقت کو بیان کیا ہے۔ ناول میں کشمیر کی خوبصورتی اور معاشرت کی تصاویر جابجا ملتی ہے۔

ناول میں کرشن چندر نے بچپن کے واقعات کو بیان کرتے ہوئے کشمیر میں موجود ذات پات کے نظام کو واضح کیا ہے۔ ان کی والدہ اس نظام کو مانتی تھی جبکہ ان کے والد کے خیال میں دنیا کے سب انسان برابر ہیں۔ ناول کے حوالے سے ڈاکٹر خالد اشرف لکھتے ہیں:

> "میری یادوں کے چندر میں جہاں جاگیر داری نظام میں مقامی راجاؤں اور ان کے اہل کاروں کے جبر واستحصال کے نمونے سامنے آتے ہیں وہیں غریب و معصوم عوام کی انسان دوستی، نیک نفسی اور اطاعت گزاری کی مثالیں بھی سامنے آتی ہیں۔"(۳۱)

"میری یادوں کے چنار" میں کشمیر اور پنجاب میں پائے جانے والی طبقاتی نظام کو دکھایا گیا ہے۔ کرشن چندر نے ناول میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جن لوگوں کو سماج نے نیچ اور بد ذات قرار دیا ہے وہ لوگ دراصل

معاشرے میں ایماندار، محنتی اور وفادار انسان کے طور پر اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ مصنف نے سماجی صورت حال بیان کرتے ہوئے کشمیری تمدن کی خوبصورت جھلکیاں پیش کی ہیں:

"ڈاک بنگلے کے پیچھے کا ایک بہت بڑا درخت تھا اور اسی طرح
کے چار پانچ درخت ندی کے کنارے کنارے دور دور کھڑے
تھے اور یہ اتنے بڑے بڑے درخت تھے اور اتنے گھنے تھے کہ
ان کے نیچے بکر والوں نے اپنے خیمے لگائے تھے اور خیموں سے
باہر چولہوں میں آگ جل رہی تھی اور بکر وال عورتیں اپنے سر
کے دونوں طرف بالوں کی مینڈھیاں لٹکائے کانوں میں چاندی کی
بڑی بڑی بالیاں پہنے مکئی کی روٹیاں سینک رہی تھیں۔"(۳۲)

کرشن چندر نے اس ناول میں چناروں اور لالہ زاروں کے رنگ دکھاتے ہیں۔ کرشن چندر آہستہ آہستہ مناظرِ فطرت کی وضاحت کے ساتھ ساتھ سماجی ناہمواریوں کو بھی سامنے لائے ہیں۔

V. شکست:

"شکست" ناول کرشن چندر نے تحریر کیا ہے۔ اس ناول کو ۱۹۴۳ء میں ساقی بک ڈپو سے شائع کیا گیا تھا۔ کرشن چندر کا بچپن چونکہ کشمیر میں گزرا ہے اس لیے اس خطے کے دلفریب اور قدرتی مناظر کے ساتھ ساتھ کشمیری عوام کے فرسودہ رسومات بھی ناول میں نظر آتی ہے۔ ناول میں کرشن چندر نے "میری یادوں کے چنار" کی طرح قدرتی مناظر کی بھرپور عکاسی کی ہے جو کہ اس ناول میں خوبصورتی اور متوجہ کا باعث ہے۔ اس کے علاوہ معاشرت کے مناظر بھی نظر آتے ہیں۔

"یکایک آفتاب مغرب میں غروب ہو گیا اور حد نظر تک
آنکھوں کے سامنے ایک خوب صورت وادی پھیلتی گئی

سورج کے ماہی گیر نے ان میں آخری بار اپنا سنہری جال
وادی کی گہرائیوں میں پھینکا اور نیلے جنگلوں سے ڈھکے
ہوئے دور ایستادہ سلسلہ ہائے کوہ، دھان کے ایک ہل
کھیت، ندی کا چمکیلا پانی، لکڑی کے چھوٹے چھوٹے پل
، ناشپاتیوں کے جھنڈ شفق کے زیریں دام میں گرفتار
آئے ہوا کے ہلکے ہلکے لطیف جھونکے بھی رک کر آتے
ہیں جیسے اس کا میٹھا مدھم سانس بھی اس جال میں الجھ کر
رہ گیا ہو۔"(۳۳)

ایک اور جگہ عزیز احمد کشمیر کے فطری مناظر کی تعریف یوں کرتے ہیں:

"ابھی چاروں طرف مکمل سناٹا تھا۔ جولائی کی بہاریں پر فضا
تھیں۔ گل وادی کی کیاریاں کسی رنگین شطرنج کی بساط کی طرح
بچھی ہوئی تھیں۔ کشمیری سیب ابھی گلابی نہ ہوئے تھے اور فرنج
سیب ابھی بالکل سبز تھے۔ ان کے قریب ہی آزوؤں کے درختوں
کا ایک چھوٹا سا جھنڈ تھا۔ اس جھنڈ کے دامن میں سونف کے
پودے کھڑے تھے اور ان کے پرے نیلو فر کی خاردار جھاڑیاں
سبزہ یہاں اس قدر گنجان تھا اور سایہ اس قدر گھنا کہ یہ جگہ
سارے باغ سے الگ تھلگ تاریک اور سکون آمیز معلوم ہوتی
تھی۔"(۳۴)

کرشن چندر نے کشمیر کے قدرتی مناظر کو اس کے ثقافتی تناظر میں بیان کیا ہے جس سے کشمیر کی ثقافت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

VI. حبہ خاتون:

سید نظر زیدی نے ناول "حبہ خاتون" لکھا ہے۔ یہ ناول ۱۹۵۸ء میں لاہور سے شائع ہوا ہے۔ مصنف نے ناول میں کشمیر کی مشہور شاعرہ حبہ خاتون کی زندگی کو بیان کرتے ہوئے کشمیر کے دیگر موضوعات کو بھی شامل کیا ہے۔ کشمیر کی وادی کی منظر کشی کے حوالے سے نظر زیدی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ خوبصورت اور مؤثر منظر نگاری ان کی بنیادی خوبی ہے۔ کشمیری کی خوبصورتی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کشمیر جنت نظیر کی سہاگن زمین پر حد نگاہ تک بکھرے ہوئے
رنگ رنگ کے پھول، سدا بہار سبزہ زاروں پر گوٹہ کناری کی
طرح جگمگائے ہوئے دریا، نگینوں کی طرح جھمل کرتی جھلیں،
فردوسی سازوں کی طرح گنگنائے ہوئے چشمے اور آبشار، ہمہ
وقت فضا میں گونجتے ہوئے پرندوں کے گیت، کونے کونے میں
بسی ہوئی خوشبو، مقدس بلند اور پر وقار گنبدوں کے ابھار، کسی
دوشیزہ کے سر سے ڈھلے ہوئے آنچل کی طرح پر بہار ڈھلوانیں
اور رفق و پر جلال پہاڑ، اسکا یہ سادہ ماحول ان تمام نعمتوں سے مالا مال تھا۔"(۳۵)

نظر زیدی نے قدرتی مناظر کے بیان کے ساتھ ساتھ مقامی رسومات کا ذکر بھی کیا ہے۔ کشمیر میں پائی جانے والی توہم پرستی کو یوں پیش کرتے ہیں:

"پیر صاحب کے گاؤں سے واپس آتے ہوئے زون کے سوا
یہ ساری عورتیں حد سے زیادہ خوش تھیں۔ ان میں سے کسی

نے اپنی بہو کا اقتدار کم کرنے کے لیے تعویذ لیا تھا۔ کسی نے
ساس کو قابو کرنے کے لیے دعا کرائی تھی۔ کوئی اپنے خاوند کو
مٹھی میں بند کرنے کی متمنی تھی کوئی بیٹے کی آرزو لے کر آئی
تھی اور اب انس بی کو پورا پورا یقین ہو گیا تھا کہ ان کی آرزوئیں
پوری ہو کر رہیں گی۔ (۳۶)

کشمیری ثقافت ایک وسیع ثقافت ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ تنوع کا شکار ہو رہی ہے۔ ہر دور کے مصنف نے اپنے دور کے لحاظ سے کشمیری ثقافت کی عکاسی کی ہے۔ کشمیر دنیا میں پایا جانے والا منفرد علاقہ ہے۔ ہر علاقے میں کچھ خصوصیات پائی جاتی ہے جس کی ثقافت نمائندہ ہوتی ہے۔ کشمیری ثقافت میں عصری تبدیلیوں کی وجہ سے تبدل آرہا ہے۔ کشمیری ثقافت کا جائزہ لیا جائے تو کئی ایسے عناصر ملتے ہیں جو جموں کشمیر اور آزاد کشمیر میں منفرد پائے جاتے ہیں ۔اکیسوی صدی میں دنیا کے گلوبل ویلج بن جانے کے بعد کشمیری ثقافت میں مزید تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ دنیا کی ہر ثقافت وقت کے تقاضوں کے لحاظ سے اپنے اندر کچھ نہ کچھ تبدیلیاں لازمی لاتی ہے ورنہ ثقافت زمانے سے پیچھے رہ کر زوال کا شکار ہو جاتی ہے۔ کشمیری ثقافت میں بھی یہ تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔

حوالہ جات

۱. خلیفہ عبد الحکیم، ڈاکٹر، "ثقافت"، مشمولہ: کلچر: منتخب تنقیدی مضامین، مرتبہ: اشتیاق احمد، بیت الحکمت، لاہور ، ۲۰۲۳ء، ص:۳۶

۲. غلام علی الانا، ڈاکٹر، زبان اور ثقافت، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء، ص:۲۰۶

۳. غلام عباس، ڈاکٹر، اردو تنقید اور پاکستانی کلچر کے مسائل، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا، ۲۰۱۷ء، ص:۲۲

۴. سید عبد اللہ، ڈاکٹر، کلچر کا مسئلہ، علمی پرنٹنگ پریس، لاہور، اپریل، ۱۹۷۷ء، ص:۱۴

۵. جمیل جالبی، ڈاکٹر، (انٹرویو)، مشمولہ: ادب، کلچر اور مسائل، مرتبہ: خاور جمیل، رائل بک کمپنی، صدر کراچی، ۱۹۸۶ء، ص:۳۹۲

۶. کرار حسین، پروفیسر، "پاکستانی کلچر اور اس کے مسائل"، مضمون مشمولہ: نیا دور، شمارہ ۴۷۔۴۸، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص:۳۳

۷. روتھ بنِٹی ڈکٹ، نقوش ثقافت، مترجم: سید قاسم محمود، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص:۴۵

۸. ایضاً، ص:۶۸۰

۹. مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، ثقافتی بشریات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء، ص:۳۸۵، ۳۸۴

۱۰. ایضاً، ص:۶۰

۱۱. سلیم اختر، ڈاکٹر، ادب اور کلچر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص:۳۱۲، ۳۱۱

۱۲. مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، ثقافتی بشریات، ص:۲۳۵

۱۳. جمیل جالبی، ارسطو سے ایلیٹ تک، ایجوکیشنل پبلشنگ ھاوس، دہلی، ۱۹۷۷ء، ص:۳۴۰

۱۴. مظفر حسن ملک، ثقافتی بشریات، ص:۴۰

۱۵. نصیر احمد، ڈاکٹر، اسلامی ثقافت، فیروز سنز، س۔ن، ص:۱۰

۱۶. روتھ بنِٹی ڈکٹ، ڈاکٹر، نقوش ثقافت، مترجم: سید قاسم محمود، ص:۲

۱۷. نظیر صدیقی، "ثقافت اور اس کے عوامل"، مشمولہ: کلچر: منتخب تنقیدی مضامین، مرتبہ: اشتاق احمد، ص:۲۹۵

۱۸. مظفر حسن ملک، ثقافتی بشریات، ص:۱۸۹

۱۹. ایضاً، ص:۳۳

۲۰. روتھ بیٹی ڈکٹ، ڈاکٹر، نقوش ثقافت، مترجم: سید قاسم محمود، ص:۲۸۳

۲۱. پیٹر بیری، پروفیسر، بنیادی تنقیدی تصورات، مترجم: الیاس بابر اعوان، عکس پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص:۲۰۱

۲۲. مظفر حسن ملک، ثقافتی بشریات، ص:۴۹

۲۳. اشتیاق احمد، کلچر: منتخب تنقیدی مضامین، ص:۴۱۱

۲۴. مظفر حسن ملک، ثقافتی بشریات، ص:۱۸۱

۲۵. ابوسعید قریشی، پرانا قالین، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص:۷

۲۶. ایضاً، ص:۱٦

۲۷. ایضاً، ص:۷

۲۸. اے۔ حمید، ڈاک بنگلہ، خالد بک ڈپو، لاہور، ۱۹٦۴ء، ص:۹

۲۹. اے۔ حمید، اور چنار جلتے رہے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص:۳۱

۳۰. ایضاً، ص:۲۴

۳۱. خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، اردو مجلس، دہلی، ۱۹۹۴ء، ص:۲۰۴

۳۲. کرشن چندر، میری یادوں کا چنار، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹٦۲ء، ص:۳۸

۳۳. کرشن چندر، شکست، ساقی بک ڈپو، دہلی، ۱۹۴۳ء، ص:۳

۳۴. ایضاً، ص:۱۲

۳۵. نظر زیدی، سید، حبہ خاتون، مدینہ پریس، لاہور، ۱۹۵۸ء، ص:۱٦

۳٦. ایضاً، ص:۸۸

باب دوم:

منتخب ناولوں میں کشمیری ثقافت کے مظاہر

کشمیر ایشیاء کی منفرد ریاست ہے جو نا صرف ایشیاء میں بلکہ دنیا میں اپنی منفرد پہچان رکھتی ہے۔ کشمیر جغرافیائی لحاظ سے پاکستان اور بھارت دونوں ملکوں کے درمیان سرحد کا کام کرتا ہے۔ کشمیر ۱۹۴۸ء میں دو ریاستوں مقبوضہ جموں کشمیر اور آزاد کشمیر میں تقسیم ہو گیا تھا۔ آزاد کشمیر پاکستان نے آزاد کروایا جبکہ مقبوضہ کشمیر میں آج بھی بھارت قابض ہے۔ دو ریاستوں میں تقسیم ہونے کے باوجود کشمیر کی ثقافت آج بھی اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ وقت کی تبدیلی اور ایک ہی ریاست کا غلامی اور آزادی میں تقسیم ہونے کی وجہ سے کشمیر کی ثقافت میں تنوع پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دونوں ملکوں کی اپنی اپنی ثقافت نے بھی کشمیر کی ثقافت پر اثرات مرتب کیے ہیں۔ کشمیر میں پائے جانے والے مختلف مذاہب اور ان مذاہب پر آزادی اور غلامی کے اثرات کشمیری ثقافت میں تنوع کا سب سے بڑا باعث ہیں۔

منتخب اردو ناول "آگ" میں ثقافتی مظاہر

عزیز احمد کا ناول "آگ" ۱۹۴۶ء میں پہلی بار شائع کیا گیا تھا۔ اس ناول میں عزیز احمد نے کشمیر کی زندگی کی عکاسی کے علاوہ کشمیر کی خوبصورتی اور ثقافت کو بیان کیا ہے۔ عزیز احمد کے باقی ناولوں میں بھی کہیں نہ کہیں کشمیر کی جھلک نظر آتی ہے لیکن ناول "آگ" میں لینڈ سکیپ ہی کشمیر کا دیکھایا گیا ہے جس میں کشمیر کی تاریخ، اس کے رسم ورواج، رہن سہن کے طریقے، لوگوں کے رویے الغرض ہر وہ عنصر جو ثقافت کے بُنت میں اہم کردار ادا کرتا ہے ، سبھی کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ عزیز احمد نے چوہدری ریاض احمد کو خط لکھتے ہوئے ناول "آگ" کی پسندیدگی کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں "اپنے ناولوں میں مجھے آگ سب سے زیادہ پسند ہے۔ کیوں کا جواب دینا مشکل ہے۔ شاید اس لیے کہ کشمیر سے مجھے ہمیشہ محبت رہی ہے۔"(۱) عزیز احمد نے کشمیر میں وقت گزرا ہے جس کی وجہ سے آپ کے ناول میں بڑی باریک بنیوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔

ناول "آگ" کو عزیز احمد دو حصوں میں بانٹتے ہیں۔ ناول میں تین مختلف نسلوں کی کہانی ہے جن کا تعلق ایک ہی خاندان سے ہے۔ زمانی لحاظ سے "آگ" کا زمانہ ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۴۶ء تک کا دور ہے۔ ناول کا پہلا حصہ "شنیدہ"

میں عزیز احمد اپنے وسیع مطالعہ اور تجربے کو بیان کرتے ہیں جبکہ دوسرے حصے "دیدہ" میں وہ واحد متکلم بن کر کشمیر کی ثقافت اور اس کی زندگی کو بیان کرتے ہیں۔

"آگ کا کینوس بڑا وسیع ہے۔ بظاہر تو یہ ایک خاندان کی کہانی
ہے لیکن پس منظر میں کشمیر کی تاریخ، تہذیب و ثقافت اور
خصوصاً مسلمانوں کی زندگی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔"(۲)

"آگ" ناول میں چونکہ کشمیر ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے اس لیے کشمیر کے متعلق چھوٹی چھوٹی جزئیات کو اس ناول میں تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔ کشمیر کے قدرتی مناظر سے لے کر رہن سہن کے طریقوں اور اس پر حالات کے اثرات کو جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ناول کے اندر مختلف نسلوں کی بات کی گئی، جو اپنے اپنے وقت اور زمانے کے نظریات کو اس طرح بیان کرتی ہیں کہ ثقافت میں آنے والے تنوع کی بنیادی وجوہات کا پتہ لگانا آسان ہو جاتا ہے۔ ہر نسل اپنے دور کے خیالات و نظریات کی عکاسی کرتی ہیں۔ ڈاکٹر طاہرہ سرور اپنے آرٹیکل میں لکھتی ہیں:

"عزیز احمد کے ہاں جزئیات نگاری بڑی توانا، خوبصورت اور اثر
انگیز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ناول کے موضوع، کردار
اور معاشرے کے ثقافتی پس منظر سے واقف ہیں۔ کشمیر کی
معاشرت کو بیان کرتے ہوئے عزیز احمد نے چھوٹی چھوٹی باتوں
کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور مقامی لوگوں کے رہن سہن سے
ہمیں پوری واقفیت ہو جاتی ہے۔"(۳)

اردو کے بے شمار ناولوں میں کشمیر کو بطور موضوع اپنایا گیا ہے لیکن عزیز احمد نے کشمیر کی عکاسی منفرد انداز میں کی ہے جو کسی دوسرے ناول میں نظر نہیں آتی۔ عزیز احمد نے کشمیر کی ثقافت، قدرتی مناظر، تاریخ کے علاوہ وہاں کے لوگوں کے درپیش مسائل کو بھی اجاگر کیا ہے۔ جس کے ذریعے یہ باور کروایا گیا ہے کہ دراصل کشمیر اپنے دلفریب حسن

کے ساتھ ساتھ اپنے لوگوں کے لیے کئی مسائل کا بھی باعث ہے۔ حالات کی تبدیلی کی وجہ سے عوام کے لیے ان مسائل میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ یوسف سرمت لکھتے ہیں:

"کشمیر اگرچہ اردو ناول اور افسانے میں متعدد بار موضوع بن چکا ہے۔ لیکن کشمیر کی ایسی اور اتنی سچی تصویریں اردو کے کسی اور ناول میں نظر نہیں آتیں۔ اس میں کشمیر کی زندگی کے سب ہی کربناک پہلو آگئے ہیں۔"(۴)

الف۔ مناظر فطرت کا مطالعہ: ثقافتی تناظر میں

فطرتی مناظر کسی بھی علاقے کی پہلی پہچان ہوتے ہیں۔ جمالیات کے ذریعے سے ہی علاقے کی ثقافت کے عناصر کو طے کیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی بھی علاقے میں پائے جانے والے قدرتی مناظر مثلاً پہاڑ، دریا، سبزہ وغیرہ اس علاقے کے رہن سہن کو طے کرتا ہے۔ میدانی علاقے کے رہنے والے لوگ اپنے اردگرد کے ماحول کے مطابق اپنے لباس، رہن سہن، زبان، رسومات کا تعین کرتے ہیں، اسی طرح پہاڑی لوگوں کے رہن سہن کا طریقہ اس کی آب وہوا اور خطے کے عناصر طے کرتے ہیں۔ ثقافت اور جمالیات ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ ثقافت اور نیچر کے تعلق کے بارے میں وزیر آغا لکھتے ہیں:

"کلچر نیچر کی نابینا آنکھوں کو نور مہیا کرتا ہے۔ اسے فاصلوں اور رفعتوں سے آشنا کرتا ہے۔ اس عمل کو نیچر کی قلب ماہیت کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ مگر کلچر کا عمل مسلسل نہیں ہے۔ نیچر کی صورت تو یہ ہے کہ وہ ہمہ وقت زمین سے گویا اُگ رہا ہوتا ہے۔ کلچر اس کی تراش خراش کرکے اسے نکھارتا اور سنورتا ہے۔"(۵)

کلچر کا انحصار فطرت پر ہے۔ جس طرح کا فطرتی ماحول ہو گا، اسی لحاظ سے مقاصدِ ثقافت طے کیے جائیں گئے۔ زراعت، جنگلات، حیوانیاتی زندگی اور بحری مخلوق وغیرہ کسی نہ کسی تبدل اور تغیرات کا پتہ دیتی ہے۔ دنیا کی ابتداء کے وقت جب انسان ابھی اتنا ترقی یافتہ نہیں ہوا تھا تو اس وقت کی ثقافت میں اور اکیسویں صدی کے ثقافت میں کافی تنوع پیدا ہو چکا ہے۔ قدرتی عنصر میں تغیر و تبدل اس کا بڑا سبب ہیں۔

کشمیر جنت نظیر علاقے کو خدا نے نہایت حسین خطہ بنایا ہے۔ اس خوبصورتی کی بنا پر ہی کشمیر کو ایشیاء کا دل کہا جاتا ہے۔ کشمیر کی بڑی پہچان اس کی برف پوش پہاڑیاں ہیں۔ کشمیر کے چپکے چپکے میں رعنائی اور دل کشی کے ایسے مناظر موجود ہیں کہ انسان کی عقل دھنک رہ جاتی ہے۔ آسمان سے باتیں کرتیں فلک بوس پہاڑیاں دلفریب مناظر پیش کرتی ہیں۔ اس کے بارے میں ایس۔ ایم۔ اقبال اپنی کتاب "The Culture of Kashmir" میں لکھتے ہیں:

> " The Vale of Kashmir is picturesquely set in
>
> the lap of the snow-clad Himalayes with such
>
> an unrivalled combination. Nowhere excelled
>
> of vast expanses of flat country which rich
>
> alluvial soil,lofty and glacial mountains, crystal
>
> streams,That this valley is one of the most
>
> beauty spots in the world."(6)

کشمیر کا ہر علاقہ اپنے برف پوش پہاڑیوں اور خوبصورتی کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ زیر تحقیق ناول میں کشمیر کے علاقے "لداخ" کے فطرتی مناظر کو پیش کیا گیا ہے۔ لداخ مقبوضہ کشمیر میں واقع ہے۔ خوبصورت وادی اور بلند و بالا پہاڑوں کی وجہ سے ہر سال لاکھوں کی تعداد میں سیاح لداخ کا رخ کرتے نظر آتے ہیں۔ لداخ میں برف باری اور اس کے بعد نظر آنے والی پہاڑیوں کی خوبصورتی اپنی مثال آپ ہے۔ لداخ کی خوبصورتی بیان کرتے ہوئے عزیز احمد لکھتے ہیں۔

"دور زوجی لا کی بلندی پر برف کسی پرانے گناہگار کی سفید داڑھی
کی طرح چھائی ہوئی تھی۔ گنگابل کے پہاڑ پر برف کی قاشیں اس
طرح چسپاں تھیں جیسے کسی بد تمیز نے ٹیڑھی انگلیوں سے کالی کے
توس پر تازہ مکھن کی لکیریں کھینچی ہوں"۔(۷)

کشمیر کی خوش کن وادی اپنی شاندار آب و ہوا، خوبصورت مناظر کے لیے مشہور ہے۔ یہ خوش کن وادی جہاں مختلف ذوق اور دلچسپی کے ساتھ زندگی کو اور زیادہ پُر لطف بناتی ہے وہاں ہی کشمیر کی وادی میں چنار اور چنار جیسے درخت ہر حصے کو مزید خوبصورت بناتے ہیں۔ اسے لیے اس وادی کو "ایڈن آف دی ایسٹ" کے عنوان سے نوازا گیا ہے۔ جو مختلف فنکاروں اور ادیبوں کو دعوت فکر دیتی ہیں۔ عزیز احمد چناروں کی خوبصورتی کو بیان کرتے ہوئے ناول "آگ" میں لکھتے ہیں "پھر وہی اخروٹ کی کلیاں اور لالے، اور بہار کے پھول اور چنار کی پتیاں اور چنار کے سائے میں سبزے پر نسترن کا فرش اور سری نگر کا بند اور انورجو(۸)۔ عزیز احمد نے ناول میں کشمیر میں بہار کا موسم کی خوبصورتی کو بیان کیا ہے جس وقت قدرت اپنے تمام تر مناظر کو بکھرتی ہے۔ چنار کشمیر کی خاص پہچان ہے۔ کشمیری زبان میں چنار کو "بون" کہا جاتا ہے جبکہ چنار "شاہی درخت" کے نام سے بھی اپنی پہچان رکھتا ہے۔ چنار اگرچہ ایک پھل دار درخت نہیں ہے لیکن کشمیر ثقافت میں اسے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کشمیری جغرافیہ، خاص کر کشمیری فطرتی مناظر میں یہ ایک الگ مقام رکھتا ہے۔

"چنار کے پتے، بڑے بڑے لہکتے، پانچ انگلیوں والے رس دار
پتے، اپنے دیو ہیکل، دیو پیکر درخت پر ہوا میں جھوم رہے تھے
اور تالیاں بجا رہے تھے۔ نیچے نسترن کا قالین اسی بے ترتیبی
سے بچھا ہوا تھا۔ کہیں نسترن کی سفیدی سبزے کے ہرے
فرش پر غالب تھی تو کہیں سبزے کے ٹکڑے اس سفید چادر
میں نمایاں تھے۔"(۹)

چناروں کے علاوہ عزیز احمد نے اپنے ناول میں چیڑ، دیوار، صنوبر، بند مجنوں، ابر، زعفران کے درختوں کی بھی بات کی ہے۔ کشمیر کے درختوں کی خوبصورتی بیان کرتے ہوئے چراغ حسن کہتے ہیں کہ کشمیر میں پہاڑوں کے ساتھ جہاں کہیں میدان ہیں وہاں چنار کے درخت لازمی طور پر پائے جائیں گے۔ ان درختوں کے پتے خزاں میں مہندی کے رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں جس کو دیکھ کر کسی بھی جمال پرست انسان کے دماغ میں اپنے عاشق کا خیال آتا ہے۔ یہ مناظر جگہ جگہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔

"سب سے اوپر روپہلے پہلے برج، پتلی پتلی شاخیں اور چکنی

چھال سمیت برف کی سرحد پر استادہ تھے۔ پھر دیوار، چیل،

صنوبر درجہ بدرجہ نیچے اترتے ہوئے، تیز بہتے، پتھروں اور

چٹانوں سے الجھتے، تھپیڑے کھاتے ہوئے چشمے کے کنارے

تک پہنچ رہے تھے۔"(۱۰)

پہاڑیوں اور چنار کے علاوہ کشمیر کی تیسری بڑی پہچان وہاں بہنے والے دریا ہیں۔ جو اس وادی کی خوبصورتی میں حد درجہ اضافہ کرتے ہیں۔ کشمیر میں کئی جھیلیں اور دریا بہتے ہیں۔ پاکستان میں بہنے والے پانچ دریا کشمیر ہی سے بہتے ہوئے پاکستان میں داخل ہوتے ہیں۔ بلند و بالا پہاڑیوں میں یہ خم کھاتے دریا قدرت کا منفرد رخ پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ چراغ حسن حسرت لکھتے ہیں:

"پورے علاقے میں کوئی جگہ ایسی نہیں جس کی اونچائی ۹ ہزار

فٹ ہے۔ جنوبی حصے میں کئی جھیلیں ہیں۔ ان میں سے ایک جو

پندرہ میل لمبی ہے دس ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔"(۱۱)

ناول "آگ" میں کشمیر کے قدرتی مناظر کے بیان پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی لکھتے ہیں:

"کشمیر کی زندگی کی اتنی حقیقی اور واضح تصویر شاید ہی اردو

کے کسی اور ناول میں اس تفصیل سے پیش ہوئی ہو، یہاں

کشمیری عوام، کشمیر کے قدرتی مناظر جھلیں، ہاؤس بوٹ،

شکاری بھی ہیں۔"(۱۲)

ثقافتی تناظر میں کسی بھی علاقے کا مطالعہ نا صرف اس کی خوبصورتی بلکہ اس کے تاریخی حوالے سے بھی کیا جاتا ہے۔ کسی بھی علاقے کی تاریخ کا اس علاقے میں موجود قدرتی مناظر سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ثقافت اور تاریخ ایک دوسرے کی تکمیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تاریخ ماضی کے واقعات اور تجربات کے نتائج فراہم کرتی ہے جبکہ ان نتائج سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مقامی لوگ اپنی ثقافت کے مقاصد اور عنصر طے کرتے ہیں۔ تاریخ کے اثرات ثقافت پر پڑتے ہیں بلکہ یوں کہنا زیادہ بہتر ہے کہ ثقافت کی بناوٹ میں تاریخ بنیادی عنصر ہے۔ مثلاً کسی علاقے میں کوئی دوسری قوم حملہ وار ہوتی ہے اور وہاں اپنی حکومت قائم کر کے اپنے اصول و قوانین قائم کرتی ہے۔ جو مقامی کلچر پر اثر انداز ہوں گے۔ وقت کے تنوع کے ساتھ ساتھ یہ واقعہ تاریخ کا حصہ بنتا جائے گیا اور کلچر پر اس کے اثرات مضبوط سے مضبوط ترین ہوتے جائیں گے۔ اسی طرح معاشرتی تبدیلیوں اور انقلابات کا اثر لوگوں کے رہن سہن پر بھی ہوتا ہے جو ثقافتی تنوع کی وجہ بنتا ہے۔ تاریخ ہمیں اس تنوع کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ ڈاکٹر مظفر حسن ملک لکھتے ہیں:

"اس (تاریخ) اصطلاح سے بالعموم کسی قوم کے ایسے واقعات

کا بلحاظ زمانہ بیان مقصود مراد ہے، جن کی بدولت متعلقہ قوم

تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی، مالی اور سیاسی نشیب و فراز سے گزری

ہو کیونکہ ایسے حادثات ہی اس (ثقافت) کے عمل ارتقاء میں

ممد و معاون ہوتے ہیں۔"(۱۳)

کسی بھی قوم کی تاریخ کا تعین کرنا ایک مشکل مرحلہ ہے کیونکہ آغاز دنیا سے ثقافت کی ابتداء ہو گئی تھی۔ جیسے جیسے انسان ترقی کرتا گیا اور مختلف قبائل میں تقسیم ہوتا گیا ویسے ویسے اس کی ثقافت میں تنوع آتا گیا۔ قوم کی تاریخ کے تعین کے بارے میں فیض احمد فیض لکھتے ہیں:

"جب ہم تاریخ اور جغرافیہ کی بات کرتے ہیں تو یہ معاشرے

کی قطعی حدود نہیں بلکہ اضافی حدود ہیں۔۔۔جہاں تک تاریخ
کا سوال ہے جس نقطے سے تاریخ کو شروع کرتے ہیں وہ فرضی
نقطہ ہوتا ہے اس لیے کہ تاریخ تو حضرت آدمؑ سے شروع ہوتی
ہے۔اس اعتبار سے سب ہی تاریخیں ایک ہی نقطے سے شروع
ہوتی ہیں لیکن ہر قوم اپنے شعور کے مطابق یا اپنی پسند سے ایک
نقطہ فرض کر لیتی یا اختیار کر لیتی ہے۔"(۱۴)

دنیا کی دوسری ثقافتوں کی طرح کشمیر کی ثقافت پر بھی تاریخ نے گہرے اثرات ڈالے ہیں۔کشمیر کی کئی ہزار سالہ تاریخ کا عکس کشمیری ثقافت میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ناول "آگ" میں عزیز احمد نے کشمیری کلچر کے علاوہ کشمیر کی تاریخ پر خصوصی توجہ دی ہے۔عزیز احمد نے ناول میں کشمیر کی تاریخ کا آغاز بدھ مت کے قافلے کی آمد سے کیا ہے:

"بڑے بڑے برف پوش دیو تا دیواروں اور صنوبر کے لبادے
پہنے برستی ہوئی برف نہا رہے تھے پھیلتی ہوئی دھند میں حمام کر
رہے تھے اور ایک قافلہ پھر اسی راستے سے گزر رہا تھا جس سے
ہزاروں سال پہلے بدھ مت کے متوالے چینی سیاح نے ہندو
ستان کے سفر کے بعد اپنے وطن کا رُخ کیا تھا۔"(۱۵)

بدھ مت کے قافلے کشمیر میں ہمالیہ کے پہاڑیوں سے گزرتے ہوئے سارے ہندوستان میں پھیلے۔بدھ مت کی ہندوستان میں آمد ۵ صدی قبل مسیح سے ہوئی۔بدھ مت کی آمد کے ساتھ مغرب کی دنیا کو مشرق کی طرف آنے کا راستہ مل گیا تھا۔بدھ مت کی تاریخ کی مختلف روایات یہ ثابت کرتی ہیں کہ کشمیری ثقافت پر ان کے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔بدھ مت کے بعد مختلف نسلوں کے لوگ ہندوستان پر حملہ آور ہوئے اور ان حملہ آوروں میں سے زیادہ تر نے کشمیر کی شاہراہ کو ہی اپنا راستہ بنایا۔

"یہ شاہراہ، یہ شہ رگ، کشن خاندان کی شہنشاہت کو جو ہمالیہ
کے گھوڑے پر سوار تھی، رگِ جان کی طرح مربوط رکھتی تھی
۔اس راستے سے انسان آئے، مہاجنی نظام آئے، سامراج آئے
، جراثیم آئے، نمدے آئے، مذہب آئے، اس انسان، اس
حیوان کے ساتھ جو کچھ آیا کرتا ہے، سب آیا۔"(۱۶)

مختلف قافلوں کی آمد سے کشمیر کی روایت تبدیل ہوتی رہی۔ مسلمانوں کی کشمیر میں آمد کا آغاز ۱۳۲۴ء میں ہوا۔ جس کے بعد کئی مسلمان فاتحین نے کشمیر کی سرحدوں پر قدم رکھا۔ مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی مسلمانوں نے کشمیری ثقافت پر اپنے اثرات مرتب کرنا شروع کیے۔ مسلمان بادشاہوں کا یہ شیوہ رہا ہے کہ جہاں بھی جاتے وہاں مذہب اسلام کی ترسیل کے ساتھ ساتھ مختلف اسلامی فن تعمیر کے نشانات بھی چھوڑتے۔ عزیز احمد نے کشمیر میں مسلمانوں کے فن تعمیر کا ذکر کرتے ہوئے ان کے بنائے ہوئے کئی باغات کا ذکر کیا ہے۔ "منشی باغ، پھر رام منشی باغ، پھر شیو پورہ کا پورا میل برابر چکر"(۱۷)۔ یہ تمام علاقے مسلمانوں کی طرز تعمیر کے شاہکار سمجھے جاتے ہیں۔

ناول "آگ" ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۴۵ء کے واقعات پر مبنی ہے۔ اس وقت کشمیر پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت تھی۔ راجہ صاحب نے اپنی حکومت سکھ شاہی کے زمانے میں بنائی تھی۔

"پنجاب کے سکھا شاہی کے زمانے میں مہاراجہ رنجیت سنگھ
نے گلاب سنگھ کو جموں کا راجہ بنایا۔ گلاب سنگھ نے کشمیر پہلے
پٹھانوں سے فتح کیا۔ پھر انگریزوں سے خریدا۔"(۱۸)

ہندوستان میں جنگ بلقان، اردو صحافت وسیاست میں تبدیلی اور تحریک علی گڑھ نے کافی تبدیلیاں مرتب کی تھی۔ پھر پہلی جنگ عظیم نے ہندوستان کے کونے کونے پر اپنے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس دور میں کشمیر انگریز حکومت کی آماد جگاہ تھا۔ انگریز حکومت کے آفسر کشمیر کی خوبصورتی اور اس کی ثقافت کو دیکھنے کشمیر جاتے تھے۔ "دیوی جی، مسٹر پرودوں، وہ فرانسیسی صاحب، میم صاحب مٹاین سے گاندربل اور ادھر سری نگر نومبر میں آئے۔"(۱۹)۔ کشمیر

میں ان دنوں مسلمانوں اور ہندوؤں کے جھگڑے معمول کی بات تھی۔ اکثر مسلمان رہنماوں اور ہندوؤں پنڈتوں کے درمیان مڈبھیڑ ہو جاتی تھی۔ اس کے بارے میں کشمیر کے نواب کا خیال تھا:

"یہ سب جاہلوں کا فساد ہے۔ فرقہ وار فساد۔ اب تک کشمیر اس
فضا سے محفوظ تھا۔ اب یہاں بھی یہ شروع ہو گیا۔ نہیں موسیو
پُرودوں یہ کسی زوایے سے انقلاب فرانس نہیں۔ ابھی کم سے کم
سو سال ہم لوگ حکومت کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ ابھی اس
ملک میں بڑی جہالت ہے۔"[۲۰]

۱۹۴۰ء میں قرار داد پاکستان کے بعد پورے برصغیر کی طرح کشمیر میں بھی آزادی کی تحریک شروع ہو گئی تھی۔ کشمیر کے کچھ رہنما تو اس تحریک کے حق میں تھے جبکہ کچھ کے خیال میں یہ تحریک مسلمانوں کو مزید تنزلی کے راستے پر لے کر جائے گی۔ تحریک کے حامیوں کا خیال تھا:

"بغیر ہنگامے کے آزادی نہیں ملتی۔ میرے خیال میں تو اس
وقت لیگ کو بھی کچھ کرنا چاہیے۔ کانگریس کے جیل میں بند
ہو جانے کے بعد اب مسلم لیگ ہی ہندوستان کی سب سے
اہم پارٹی ہے۔"[۲۱]

جبکہ جن لوگوں کے خیال میں یہ تحریک نہیں چلنی چاہیے ان میں زیادہ تر ہندوؤں رہنما تھے۔ جاپان اور جرمنی کے درمیان ہونے والی دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے اب ہندوستان متنازعہ علاقہ بن چکا تھا۔ جاپان کی فوجیں برطانیہ کو غلام بنانے کے لیے ہندوستان کی سرحدوں پر کھڑی تھیں۔ اس وقت ہندوستان میں چلنے والی تحریکیں ہندوستانیوں کو مزید کمزور کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر اعجاز حنیف لکھتے ہیں:

"" آگ" کے پس منظر میں بظاہر کشمیر کی زندگی ہے لیکن کشمیر

کے حوالے سے اس میں پہلی جنگ عظیم سے لے کر دوسری
جنگ عظیم کے اختتام کے ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور
معاشی حالات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ تحریک پاکستان جس
انداز میں کشمیر پر اثر انداز ہو رہی تھی اس کی ایک جھلک بھی
"آگ" میں نظر آتی ہے۔"(۲۲)

۱۹۴۵ء کا وقت کشمیر میں ہلچل کا زمانہ تھا۔ مسٹر کے ایس اللہ جو کہ ان تحریکیوں کے مخالفین میں تھے۔ ایک انگریز آفیسر کو ان تحریکیوں کی وجہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں "اجی ان لوگوں نے تو گورنمنٹ سے روپیہ لیا ہوا ہے اور پاکستان کے حامی وہ اس لیے ہیں کہ ان میں سے زیادہ تر مسلمان ہیں۔۔۔ نہیں جی ہم ہندوستان میں روس کی حکومت نہیں چاہتے۔"(۲۳) انور جوُ جو کہ کشمیر کی حکومت سے تعلق نہیں رکھتا لیکن قائداعظم کے قریبی ساتھی ہونے کی وجہ سے قائداعظم اسے کشمیر کا رہنما بنانا چاہتے تھے۔ انور جوُ کو کشمیر راجہ سے لگاؤ تھا لیکن وہ انور جوُ کو قائداعظم کے ساتھی کی وجہ سے زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔

۱۹۴۵ء کی شملہ کانفرس پورے ہندوستان میں نہایت اہمیت کی حامل تھی۔ اس کی بازگذشت کشمیر میں بھی سنائی دینے لگی۔ شملہ کانفرس میں التوا، پورے ملک میں قیاس آرائیوں کو دعوت دے رہا تھا۔ شملہ کانفرس کے التوا اور ناکامی کی ساری ذمہ داری کشمیری رہنما نے قائداعظم پر ڈال دی کہ یہ سب صرف ایک شخص، صرف مسٹر جناح کی ضد کی وجہ سے ہوا ہے۔ "اجی یہ پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان میں کیا رکھا ہے۔ اجی جو کچھ ہے ہمارا ہندوستان ہے۔ سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا۔"(۲۴) شملہ کانفرس کی ناکامی کے بعد کانگرسی لیڈر کشمیر بھی گئے جن میں جواہر لال اور مولانا ابوالکلام کا نام قابل ذکر ہے۔

کانگرسی لیڈر کے مطابق اگر اکھنڈ بھارت میں بھی ان لوگوں کے قانون چلاتے ہیں تو الگ وطن پاکستان لینے کا فائدہ کیا ہے۔ یہ وہ ہی سوچ ہے جس کی بنا پر کشمیری راجہ نے کشمیر کو آزادانہ ریاست بنانے کی کوشش کی۔ سکندر جوُ جو کہ پاکستان کے حق میں تھا اس کی وفات کے بعد کشمیر کو پاکستان کی ریاست بنانے کی تحریک کا تقریباً خاتمہ ہو گیا۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں بھارت نے کشمیر پر قابض ہو گیا۔ جس سے کشمیر ایک محکوم قوم بن گئی جس نے اس کی

ثقافت پر زیادہ اثرات مرتب کیے۔ انگریزوں اور ہندوؤں کی حکمرانی کی وجہ سے کشمیر کی مسلم ثقافت میں ہمیں دونوں قوموں کے رنگ نظر آتے ہیں۔

ب۔ جغرافیائی لحاظ سے ثقافت مظاہر کا تجزیہ

جغرافیہ سے مراد علاقے کی حد بندی ہے۔ ہر علاقہ کسی نہ کسی لحاظ سے حد بندی کرتا۔ ثقافت کا جغرافیہ سے گہرا تعلق ہے۔ جغرافیائی عوامل میں رہن سہن سے لے کر شادی بیاہ کے طریقے، ملبوسات کے انتخاب، مکانات کی تعمیر، فنون لطیفہ حتیٰ کہ آب و ہوا کے اثرات بھی شامل ہیں۔ پہاڑی علاقے کے لوگ اپنے جغرافیے کے لحاظ سے اپنا رہن سہن طے کرتے ہیں۔ ثقافت قومی مزاج کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ جغرافیائی عوامل ثقافت کے ساتھ ساتھ قومی مزاج پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ ثقافت کے جغرافیائی عوامل کے بارے میں قدرت اللہ لکھتے ہیں:

> "ایک طرف ثقافت قومی مزاج کی آئینہ دار ہوتی ہے تو دوسری
> طرف قومی مزاج جغرافیائی ماحول کے زیر اثر تشکیل پاتا ہے۔
> اس طرح جغرافیائی عوامل نہ صرف قومی ثقافت پر بلکہ قومی مزاج
> کے رشتے سے قوموں کی زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہوتے ہیں۔"[۲۵]

کشمیر جغرافیائی لحاظ سے ایشیاء کے درمیان میں جبکہ برصغیر کے شمال میں موجود ہے۔ کشمیر کا کل رقبہ ۸۴،۴۷۱ مربع میل ہے۔ کشمیر کی ریاست چار صوبوں پر مشتمل ہے۔ جس میں دو صوبے پاکستان میں جبکہ دو صوبے بھارت میں موجود ہیں۔ پاکستان کے حصے میں گلگت اور آزاد کشمیر کا علاقہ موجود ہے جبکہ بھارت میں صوبہ جموں اور صوبہ لداخ ہے۔ کشمیر کا علاقہ جغرافیائی لحاظ سے پوری دنیا میں اہمیت کا حامل ہے۔ دنیا کے پہاڑی سلسلوں میں تین بڑے پہاڑی سلسلے کشمیر میں پائے جاتے ہیں، جن میں سلسلہ قراقرم، سلسلہ ہمالیہ اور سلسلہ ہندوکش شامل ہیں۔ پاکستان اور بھارت کے علاوہ اس کی سرحدیں چین کے علاقے تبت اور افغانستان سے بھی ملتی ہیں۔ کشمیر چین کو پاکستان اور بھارت سے ملانے کا بڑا ذریعہ ہے۔ شاہراہ ریشم جو پاکستان اور چین کے ملاپ کا ذریعہ ہے کشمیر میں ہی واقع ہے۔ چراغ حسن کشمیر کے جغرافیے کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"وادی کشمیر جسے اس سرزمین کا دل کہنا چاہیے کہ ۸۴ میل لمبی
اور ۲۰ سے ۲۵ میل تک چوڑی ہے۔ اسے چٹیل پہاڑوں کی
قدرتی فصیل نے گھیر رکھا ہے۔ جن کی چوٹیاں برف سے ڈھکی
رہتی ہیں۔ گویا وادی کشمیر کیا ہے، زمرد کا ایک بڑا سا بیضوی پیالہ
ہے جو آسمان کے گنبدِ مینائی پر آنکھ مارتا ہے اور یہ چٹیل پہاڑ کالے
کالے دیو ہیں جو اس گنجِ گرانمایہ کی حفاظت کر رہے ہیں۔"(۲۶)

زیرِ نظر تحقیق میں اردو کے ناول "آگ" کو منتخب کیا گیا ہے۔ جس میں کشمیری ثقافت کے مظاہر کی عکاسی کی گئی ہے۔ جغرافیہ لحاظ سے ناول کا لینڈ سکیپ جموں کشمیر کا صوبہ "لداخ" ہے۔ لیکن ثقافت کے مظاہر میں پورے کشمیر کی ثقافت کے عناصر پائے گئے ہیں۔ لداخ بھارت کے علاقے مقبوضہ کشمیر کا علاقہ ہے جس پر فی الوقت بھارتی حکومت قابض ہے۔ کشمیر مشرق میں چین اور مغرب میں پاکستان کی سرحدوں سے ملتا ہے۔ اس کے شمال میں قراقرم اور جنوب میں ہمالیہ کا پہاڑی سلسلہ موجود ہے۔ ۱۹۴۸ء میں بھارت کے کشمیر میں قابض ہونے کی وجہ سے عالمی سطح پر کشمیر کو متنازع علاقہ قرار دیا گیا ہے۔ عزیز احمد نے ناول میں ۱۹۰۸ء سے ۱۹۴۲ء کا وقت بتایا ہے جو برصغیر کی تقسیم سے قبل کا وقت ہے۔ عزیز احمد کشمیر کی حدود کا تعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پیر پنجال کے برف پوش پہاڑ مسلسل گرمی کے ستائے ہوئے، مگر
اب بھی اپنی برفانی دستاروں سے آراستہ اسی طرح کھڑے تھے۔
دوسری طرف ہمالیہ اعظم کے پہاڑوں کا سلسلہ تھا اور ان دونوں
کے درمیان ایک وسیع فرش کی طرح کشمیر کی وادی دور تک پھیلی
ہوئی تھی۔"(۲۷)

ایک اور جگہ عزیز احمد نے کشمیر کی جغرافیائی حدود بندی کچھ اس طرح کی ہے:

"بارہ مولا سے کشمیر کی اصلی وادی شروع ہوتی ہے۔ اب پہاڑی
راستے کا پُل صراطِ ختم ہو گیا۔ جہلم کے میدانوں تک پہنچنے کے
لیے دیوانہ وار پہاڑوں میں سر پٹکنا چٹانوں سے کشتیاں لڑنا چھوڑ
دیا۔ اس طرف، ذرا دور جہلم بہہ رہی ہے۔ اور سڑک اور جہلم
کے درمیان دلدل ہی دلدل ہے۔ کھیت دلدل ہیں، نالیاں
دلدل ہیں اور اس دلدل کے درمیان ناممکن طور پر تار کول کی
سڑک، جانب اونچے اونچے، سیدھے تنے ہوئے سفیدے کے
درختوں کے سہارے اُڑی چلی جا رہی ہے۔"(۲۸)

عزیز احمد نے جغرافیائی حدود بندی میں پاکستان کے کچھ ایسے علاقوں کو شامل کر رکھا ہے جو اس وقت کشمیر کے سرحدی علاقے تھے لیکن تقسیم کے بعد پاکستان کے حصے میں آئے۔ ان علاقوں میں زیادہ تر دریائے جہلم سے تعلق رکھنے والے علاقے ہیں۔ ناول میں ایک وادی "لداخ" کی بات کی گئی ہے جبکہ جغرافیائی حدبندی کشمیر کی بتائی گئی ہے۔

بودوباش:

دنیا میں دو سو سے زائد ممالک پائے جاتے ہیں۔ ہر ملک میں رہنے والے لوگوں کے رہن سہن دوسرے ملک کے لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ بات عام مشاہدے میں دیکھی گئی ہے کہ ایک ہی ملک میں رہنے والے لوگوں کی ثقافت میں بھی تنوع پایا جاتا ہے۔ جس کی بڑی وجہ بودوباش ہے۔

"کلچر تو کسی خاص خطہ زمین میں موجود عناصر کی آمیزش اور
آویزش سے خود بخود ایک خاص رنگ اختیار کرتا ہے۔ ان
عناصر میں ہوا، پانی، موسم، زمین کی خاصیت اور خون کا گروپ
۔۔۔ یہ سب چیزیں شامل ہیں لہٰذا کسی خاص خطہ زمین کے

کلچر کو دوسری ثقافتوں سے جدا کر کے دکھانا ممکن ہے۔"(۲۹)

ثقافت در حقیقت علاقے کے رہن سہن کے طریقوں اور طرزِ زندگی کا نام ہے۔ مختلف دیہاتوں کے رہن سہن میں فرق ہے۔ ان کے رہن سہن اور طور طریقے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ کس علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہاں کی عمارتوں کے نقشوں، فنون لطیفہ، مصوری اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ مثلاً کسی مرد نے موٹے اور گرم لباس پہنا ہو گا تو اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ سرد علاقوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی طرح گرم علاقوں کے لوگ کچے مکان زیادہ بناتے ہیں تاکہ سخت گرمی میں دھوپ کی شدت سے بچا جاسکتا۔ سرد علاقے کے لوگ کئی منزلہ مکان تعمیر کرتے ہیں۔ جس سے وہ زمین سے اونچائی پر ہوتے ہیں۔

عزیز احمد نے ناول " آگ " میں قیام پاکستان کے وقت کشمیر کی بودوباش کو بیان کیا ہے۔ مسلمانوں نے پورے ہندوستان کی طرح کشمیر کی ثقافت پر بھی اثرات مرتب کیے تھے۔ مسلمان عہد کی بڑی پہچان فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں۔ مسلمانوں نے اپنے بنائی ہوئی عمارتوں میں فنون لطیفہ کے جو نقوش چھوڑے ہیں وہ آج بھی مسلمان عہد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وقت کے ساتھ لوگوں نے بھی اسی طرز عمل کو اپنایا اور اپنے مکانوں کی تعمیر اسی طرز پر شروع کی۔ عزیز احمد مکان کا نقشہ یوں بیان کرتے ہیں:

"اس چھوٹے سے آنگن کے چاروں طرف سہ منزلہ مکان کی
تینوں منزلوں کے چوبی چھجے معلوم ہوتا تھا سبز رنگ میں بیل
بوٹے بنے ہوئے تھے۔ یہ بیل بوٹے کیا تھے، زیادہ تر محرابوں
کی شکل کے نقش و نگار تھے۔"(۳۰)

کشمیر کا علاقہ اونچے اونچے پہاڑوں پر مشتمل ہے، جہاں گھروں کی تعمیر کا ایک خاص طرز ہے۔ وہاں کے لوگ اپنے گھروں کو مزید خوبصورت بنانے کے لیے مختلف ثقافتی اشیاء کا استعمال کرتے ہیں جن میں چینی کے مرتبان، گلدان شامل ہیں۔ جیڈ کے بھکشو، سبز جیڈ کا بنا ہوا چھوٹا سا پیکن کے مینار کا چربہ، نیلے جیڈ کا شطرنج کا فرش اور اس پر ہاتھی کے دانت کے مہرے یہ سب چیزیں کشمیری ثقافت میں نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔

"بڑے بڑے شیشے لگے تھے، جن میں جیڈ کا بڑا ہی خوبصورت
چینی سامان، چھوٹے چھوٹے مجسمے، جیڈ کے چمچے، قلم تراش،
تعویذ، لکڑی کے گوتم بدھ کے بت، کئی قسم کی تبتی اور چینی
مورتیں، ہندو دیوتاؤں کے برنجی بت، پیتل کے چھوٹے چھوٹے
بت، شیواجی مہاراج کا رقص، لکشمی، پاربتی کی بڑی موہنی مور
تیں، چینی ترکستان، تاشقند اور بخارا کے بڑے بڑے آفتابے
جن پر فارسی اور ترکی اشعار اور نقش و نگار کندہ تھے۔ اندر
دیواروں سے لٹکتے ہوئے چھوٹے چھوٹے شیرازی اور کاشانی
قالین، چینی منقش پردے، پرانی چینی، مغل راجپوت، ایرانی
تصویریں، کچھ کرم خوردہ کچھ پانی سے مٹی ہوئی۔"(۳۱)

کشمیر کی ثقافت میں قالین بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک وقت تک کشمیری قالین پوری دنیا میں نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔ آج بھی کشمیری قالین کو دنیا کے بہتر قالین مانا جاتا ہے۔ کشمیری قالین کی تاریخ کئی ہزار سالوں پر مشتمل ہے جسے عزیز احمد نے اپنے ناول میں سمویا ہے۔ کشمیری لوگ قالین کو ثقافتی عنصر کے تحت ہر موقعے میں استعمال کرتے تھے۔ کشمیر میں کئی قسم کے قالین بنانے کے کارخانے موجود ہیں۔ عزیز احمد نے قالین کی خرید و فروخت کے کئی مواقع بتائے ہیں۔ ناول میں ۱۹۰۸ء سے ۱۹۴۵ء تک کا وقت لیا گیا ہے جب انگریز برصغیر میں حکومت کر رہے تھے۔ کوئی بھی انگریز کشمیر میں سیاحت کے لیے آئے تو ثقافتی علامت کے طور پر کشمیری قالین کو ساتھ لے کر جاتا تھا۔ کشمیری قالین کی صدیوں پر مشتمل تاریخ کو عزیز احمد نے ناول کے کردار "خواجہ صاحب" کے ذریعے کئی موقعوں پر بیان کیا ہے۔ جیسے کشمیری قالین کی تاریخ کی ابتداء میں خواجہ صاحب بیان کرتے ہیں:

"جناب عیسوی صدی میں ادھر ایک بادشاہ تھا نا! بڑا عادل خدا
ترس، اس کا نام زین العابدین تھا۔ وہ سکندر بت شکن کا بیٹا تھا۔

توجناب زین العابدین سمرقند میں تیمور لنگ کے دربار میں قالین
بافی کے کمالات ہنر دیکھتا تھا۔اس نے جناب قالین بافوں کو سمر
قند سے طلب کیا اوراس طرح کشمیر میں قالین بنا شروع ہو گئے۔"(۳۲)

اس کے علاوہ خواجہ صاحب قالین کی مختلف اقسام کو بیان کرتے ہیں جو کشمیر کی پیداوار ہیں۔ یہ قالین مختلف ثقافتوں سے تعلق رکھتے ہیں جن میں بدھ مت کی ثقافت، ہندو ثقافت، مسلم ثقافت شامل ہیں۔ ان قالینوں پر مختلف مقدس علامتیں اور نشانیاں موجود ہیں۔ کئی قالینوں پر مقدس مقامات کی تصویریں ہیں۔ اس طرح بعض قالینوں پر مقدس کتب کے حوالے درج ہیں۔

"کاشانی قالین، شیرازی قالین، بخاری قالین، اندجاتی قالین،
مشہدی قالین کشمیری قالین۔ ایسے ریشمی قالین جنہیں ذرا
اٹھایئے تو معلوم ہو کہ بنارسی ساڑھی پر ساسانی ایرانیوں نے
شیروں کی تصویریں بنائی ہوں ایسے قالین جن پر سعدی کے
شاہکار خطاطی کے کمال نقش بنے ہوئے تھے۔"(۳۳)

کشمیری قالینوں پر کی گئی مصوری کشمیر کی ثقافت کی عکاس ہے۔ جدید دور میں جو قالین بنائے جارہے ہیں ان میں بھی کشمیر کی ثقافت نمایاں نظر آتی ہے۔

زبان:

زبان کسی بھی علاقے کی ثقافت کے مظاہر میں نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ زبان علاقے کی ثقافت کو پھیلانے میں مدد دیتی ہے اور دوسرے لوگوں کو علاقے کی ثقافت سے روشناس کرواتی ہے۔ ثقافت قوم کی امنگوں کی آئینہ دار ہوتی ہے لہٰذا قوم کی امنگوں اور خیالات کو دنیا تک پہنچنے کا واحد ذریعہ زبان ہی ہے۔ ناصرف دوسرے ممالک اپنے علاقے کے لوگوں تک تجارت، حکومتی احکامات، قومی قوانین پہنچتے ہیں بلکہ یہ زبان دوسرے ممالک کے لوگوں سے

روابط کا ذریعہ بھی ہے۔ زبان مختلف زبانوں کے اثرات قبول کرتی ہے۔ اگر کوئی زبان کسی دوسرے زبان یا قوم کا اثر قبول نہ کرے تو زبان کچھ ہی سالوں میں جمود کا شکار ہو کر ختم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ زبان کے ارتقاء کے لیے لازمی ہے کہ اس میں وقت کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی لائی جانی چاہیے۔ وقت کی تبدیلی کے ساتھ کچھ الفاظ زبان سے متروک ہو جاتے ہیں اور اس کی جگہ نئے الفاظ لے لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہر زبان اپنے لسانی تجربات کرتی ہے۔ ان لسانی تجربات کے نتیجے میں زبان کا اسلوب طے کیا جاتا ہے۔

"اسلوب ثقافت اور ثقافتی ضروریات کے تحت تشکیل پاتا ہے۔
کوئی زبان جتنی وسیع ہوتی ہے، الفاظ کے چناؤ میں اتنا ہی آسان
ہوتا ہے اور کسی قوم کے تجربات کی وسعت اس کی زبان کو
وسعت عطا کرتی ہے۔"(۳۴)

زبان پورے معاشرے کی عکاس ہوتی ہے۔ زبان ایک سماجی عمل ہے جس کے ذریعے معاشرہ ترقی پاتا ہے۔ ہر آنے والی نسل تک اپنے روایات پرانی نسل زبان کے ذریعے ہی منتقل کرتی ہے۔ ہر نسل اپنی زبان میں اپنے زمانے کے لحاظ سے تبدیلی لاتی ہے لیکن اس سے زبان کے اسلوب میں فرق نہیں آتا۔ البتہ وقت کی ضرورت کے تحت زبان کے الفاظ تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ایک ہی زبان کے بولنے والے لوگ اپنے خیالات و نظریات کو زیادہ اچھے طریقے سے سمجھ سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

"زبان چونکہ ایک سماجی فعل ہے، اسی لئے معاشرے کا پورا
کلچر زبان کے اندر رہی اپنا تار د پود بنتا ہے۔ زبان ہی کے ذریعے
اس زبان کے بولنے والوں کے مزاج میں مطابقت پیدا ہو کر
طرزِ فکر و عمل کا اشتراک اور تہذیبی یک جہتی کا عمل پیدا ہوتا
ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک زبان کے بولنے والے کسی دوسری
زبان کے بولنے والوں کے مقابلے میں کلچر کی ہر سطح پر زیادہ

قریب ہوتے ہیں، مشترک زبان کے ذریعے معاشرے میں

اپنے اجتماعی اور قومی وجود کا شعور پیدا ہوتا ہے۔"(۳۵)

عزیز احمد نے اپنے ناول "آگ" میں کشمیری زبان کو استعمال کیا ہے۔ زبان چونکہ علاقے کی نمائندہ ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخ کی عکاس ہوتی ہے اس لیے ہمیں کشمیری زبان میں اس کی تاریخ بھی نظر آتی ہے۔ کشمیر کی مقامی زبان میں ہندی، فارسی، بنگالی اور ایرانی کے اثرات نظر آتے ہیں۔ کشمیری زبان میں کسی سے مخاطب ہونے کے لیے " حض" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔" سلام علیک حض خواجہ صاحب۔ یہ سلام علیک دراصل سلام علیکم حض (حضرات) ہے جس سے کشمیری مسلمان ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہیں۔"(۳۶)۔ اس طرح کشمیری لوگ عزت کو "اجت"، پریم منسٹر کو "پریم مشٹر"، غریب کو "گریب"، اجازت کے لیے "ازازت"، صاحب کو "صاب" جیسے الفاظ استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ وہ مقامی الفاظ ہیں جو آج بھی کشمیری زبان میں پائے جاتے ہیں۔ عزیز احمد نے "آگ" میں کئی ایسے مقامی زبان کے الفاظ استعمال کیے ہیں جو ایرانی لہجے میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ وہ کشمیری زبان کے الفاظ کو ایرانی لہجے میں استعمال کرتے ہیں۔ مسلمانوں نے جب برصغیر پر حکومت کی تو دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ کشمیری زبان پر بھی اثرات مرتب کیے۔

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید

گر مرغ کباب است ایابال وپر آید(۳۷)

کشمیری زبان میں لفظ "کشمیر" کے لیے مختلف لہجوں اور زبانوں کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثلاً یونانی کشمیر کو "کاش پیریا" کہتے ہیں کشمیری اسے "کشیر" کہتے ہیں جبکہ فارسی میں "کشیری" کہا جاتا ہے۔ اقبال اپنے فارسی شعر میں کشمیر کو کشیری ہی کہا ہے:

کشیری کہ بابندگی خو گرفتہ

بتی می تراشد زسنگ مزاری"(۳۸)

بدلتے وقت کے ساتھ کشمیر زبان میں بھی تبدیلی آتی جا رہی ہے۔ مقامی زبانوں کے ساتھ ساتھ جنگ آزادی کے بعد کشمیری زبان میں انگریزی کے الفاظ کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن ان انگریزی الفاظ میں بھی کشمیری لہجہ جھلکتا نظر آتا ہے۔ "وھاٹ وانٹ ٹوسی صاب، جولری، کارپٹس، گباز، نمداز، پریشس، سٹونس، کیوریوز، سویزس، دھاٹ صاب، میم صاحب اسپیشلی وانٹس"[۳۹] کشمیری انگریز کو "انگریج" کے نام سے پکارتے ہیں۔ کشمیری زبان میں انگریزی زبان کے روزمرہ جملوں کے استعمالات بھی عام نظر آتا ہے۔ مثلاً "گڈ ایوننگ"، "گڈ مورنگ"، "تھینک یو"، وغیرہ کے الفاظ نظر آتے ہیں۔ انگریزی الفاظ کا استعمال مقامی زبان کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے۔ جو مختلف زبانوں کے ملاپ کا نتیجہ ہے:

"مجھے افسوس ہے راجیشوی آج لنچ پر تمھیں کوفت ہی کوفت ہوئی ہوگی۔۔۔ اور موسیو پُرودوں چکن آلاترک، چکن آلا ترک کے چٹخارے لیتے رہے۔ انھوں نے مجھ سے دریافت کیا یہ کہ پیتے دے فوآگرا کے ٹین یہاں کہاں ملتے ہیں۔ ان سے پیتے دے فوآگرا کے سوا کوئی اور سینڈوچ نہیں کھایا جاتا۔"[۴۰]

رسم ورواج:

رسم ورواج ثقافت کی بناوٹ میں نمایاں خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ رسوم ورواج سے مراد وہ تمام طریقے جو ایک قوم اپنی پوری زندگی میں اختیار کرتی ہے۔ ان طریقوں میں ولادت سے لے کر موت تک کے تمام طریقے شامل ہوتے ہیں۔ ہر علاقے کی رسم ورواج دوسرے علاقے کے رسم ورواج سے مختلف ہوتے ہیں۔ رسم ورواج میں تنوع ہونے کی بڑی وجہ وہاں کا مذہب ہوتا ہے۔ ہر مذہب کی اپنی روایات ہوتی ہیں جس کے تحت علاقہ اپنے رسم وراج طے کرتا ہے۔ مختلف علاقے کی رسومات اس علاقے کی خوبصورتی اور دلکشی بڑھانے کا سبب بنتی ہے۔ علاقے کے رسم ورواج کو قبول کرنا ہر فرد پر لازم ہوتا ہے۔ کسی بھی علاقے کی رسم ورواج کو پرکھنے کے لیے اس علاقے کے اصول وضوابط کی پابندی کرنی پڑتی ہے کیونکہ ہر علاقے اپنے نظریات کے تحت رسم ورواج طے کرتا ہے۔

"دنیا کو خاص رسموں، اداروں اور طریقوں ہائے فکر کی عینک سے
دیکھنا پڑتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنے مجرد فلسفیانہ تصورات میں بھی وہ ان
بندھے ٹکے ضوابط و تعصبات سے دامن نہیں چھڑا سکتا۔ خیر و شر
کے بارے میں اس کے ذاتی تصورات اس کی ثقافت کی مخصوص
رسوم و روایات سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور رکھیں گے۔"(۴۱)

شادی کی رسومات ثقافت میں نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ شادی میں ادا کی جانے والی رسومات میں بیشتر رسومات کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ہر علاقے کی شادی کی رسومات میں فرق ہوتا ہے۔ کشمیری روایات کے مطابق کشمیر میں بچیوں کی شادی جلد کر دی جاتی ہے۔ یہ روایت وہاں کی ثقافتی ورثے کی پہچان ہے۔ "کشمیریوں کا قاعدہ ہے جوان ہونے سے ذرا پہلے ہی اس کی شادی بارہ مولے کے ایک نانبائی قادر اسے ہو گئی تھی۔"(۴۲) شادی بیاہ کے معاملات میں اپنے والدین کی مرضی سے انکار کا تصور موجود ہی نہیں ہے۔ آج بھی بیشتر گاؤں میں والدین اپنی مرضی سے یہ سارے معاملات طے کرتے ہیں۔ کشمیر میں بارات کے لیے بیٹھنے کا خاص انتظار کیا جاتا ہے۔ یہ رواج صدیوں سے یہاں چلا آرہا ہے۔ سب باراتوں کے لیے کشمیری قالین، تکتے اور گدے بچھائے جاتے ہیں۔

"ظہری صاحب کشمیری عقد کی محفلوں میں ایک عجیب متین
وقار محسوس کرتے تھے۔ چاروں طرف دیواروں اور گدوں
کے سہارے بیٹھے ہوئے شرفاء جو صدیوں سے اس طرح بیٹھتے
چلے آئے تھے۔"(۴۳)

نکاح کے بعد علاقے میں ایک خاص رسم ادا کی جاتی ہے جسے "سلامی" کی رسم کہتے ہیں۔ اس میں دولہے یا خاندان کے کسی بڑے (والدین) کو کچھ نقد رقم دی جاتی ہے جسے کسی کاپی یا خاص جگہ لکھ لیا جاتا ہے۔ بروقت موقع دینے والے کے ہاں شادی پر اتنی ہی رقم واپس بھی کی جاتی ہے۔

"جناب یہ ہم نے اس کے پرچے میں اس واسطے لکھوایا ہے کہ

جب ہمارے بیٹے کی شادی ہو گا خواجہ صاحب بھی ہمارے بیٹے کو
پانچ روپیہ دے گا۔ اس طرح بدل پورا ہو جائے گا۔ جناب یہ ادھر
کا طریقہ ہے۔ سب ایک دوسرے کا ساتھ برابر سلوک کرتا ہے۔"(۴۴)

اس رسم کے بعد مہمانوں کو کھانا کھایا جاتا ہے۔ طعام سے فروغ ہونے کے بعد لڑکی کی رخصتی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔

ہر علاقے کی رسم ورواج میں علاقائی رسومات کے ساتھ ساتھ مذہبی رسومات کا بھی اہم کردار ہوتا ہے۔ کشمیر میں ایک اہم مذہبی رسم "نوروز" ہے جو ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ مناتے ہیں۔ یہ تہوار پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، چین اور ان کے ارگرد ممالک میں منایا جاتا ہے۔"نوروز" تہوار موسم بہار کے آغاز میں بہار کو خوش آمدید کہنے کے لیے مناتے ہیں۔ یہ تہوار ۲۱ اپریل یا اس کے اگلے یا پچھلے دن منایا جاتا ہے۔ اس روز کشمیری میں روایتی کھانے بنائے جاتے ہیں۔

"آج بیساکھی کی وجہ سے زیادہ تر ہندو اور پنڈت ہی آتے تھے۔
آج کشمیر کا نوروز تھا اور نیا سال شروع ہو رہا تھا۔ دونوں طرف
بھنے ہوئے چنے، تل، مخانے، لڈو تل کی چیزیں، کچوریاں،
پکوڑیاں اور اسی طرح کی چیزیں بک رہی تھیں۔"(۴۵)

کشمیر میں تعلیم کی شروعات میں کچھ رسومات ادا کی جاتی ہیں۔ یہ رسومات مسلمان گھرانوں میں قرآن مجید کی تعلیم لینے سے پہلے ادا کی جاتی ہے جس میں خاندان کے بڑے بزرگ شامل ہوتے ہیں اور بچے کے علم میں اضافے اور اس پر عمل کرنے کے لیے خدا سے مدد مانگی جاتی ہے۔ کشمیر میں مسلمان بچے کی تعلیم کے آغاز کے لیے باقاعدہ ایک رسم ادا کی جاتی ہے۔ اس رسم کو "بسم اللہ" کا نام دیا گیا ہے۔ یہ رسم بچے کے چار سال ہونے پر ادا ہوتی ہے۔

"ہمیشہ چار سال چار مہینے چار دن کے بعد ہر لڑکے کی بسم اللہ
ہوتی تھی۔ جس میں کوئی لولابی یا "بخاری" ملا قرآن شریف

کی کوئی سورت طوطے کی طرح پڑھاتا۔ پھر شیرینی تقسیم ہوتی
اور رات کو گوشتابے اور آب گوشت اور پورے چالیس طرح
کے کھانوں سے سارے ہم چشموں کی دعوت ہوتی۔ بسم اللہ
کے بعد فارسی عربی کے ملا صاحب کے ہاتھ تعلیم ہوتی۔"(۴۶)

یہ رسم کشمیر میں شاہ ہمدان کے زمانے سے چلی آرہی ہے۔ مسلمانوں میں یہ رسم ایک مذہبی حیثیت رکھتی ہے۔ اس رسم کے بعد ہی مسلمان بچے اپنی تعلیم کا آغاز کرتے ہیں۔ کشمیر کے علاوہ پنجاب کے مختلف علاقوں میں آج بھی یہ رسم ادا کی جاتی ہے۔

کھانے:

ہر علاقہ اپنی کچھ خصوصیات کی وجہ سے پوری دنیا میں اپنا منفرد مقام رکھتا ہے۔ ان خصوصیات میں علاقائی کھانے بھی شامل ہیں۔ علاقائی کھانے اس علاقے کی پسند وناپسند کی پہچان ہوتے ہیں۔ برصغیر کے مختلف خطے مقامی کھانوں اور ان کے ذائقوں کی وجہ سے دنیا میں اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ مقامی کھانے ثقافت کے ساتھ ساتھ مقامی لوگوں کے مزاج سے بھی آگاہی دیتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم پنجاب کی بات کریں تو مکئی کی روٹی، ساگ، مکھن، لسی پنجاب کی پہچان ہیں وہاں ہی خیبر پختونخوا میں گوشت سے بنے کھانے نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ ناول "آگ" میں عزیز احمد نے کشمیر کے مقامی کھانوں کا ذکر کیا ہے جو کشمیر کی پہچان ہے۔ عزیز احمد کشمیر میں صبح کے ناشتے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مقامی لوگ گیہوں سے بنی ہوئی چیزیں کھاتے ہیں جبکہ رات اور دن کے کھانے میں ان کے مقبول ترین خوراک چاول ہیں۔

"باقرخانیاں تیار ہو چکی تھیں۔ رجبا جلدی جلدی نان خطائیوں
کو تلنے لگا۔ کشمیر میں نان خطائیوں کو دم نہیں دیا جاتا تلی جاتی ہیں
۔ صبح کا وقت ہی ایسا ہوتا ہے جب کشمیر میں گیہوں کی چیزیں کھائی
جاتی ہیں ورنہ دوپہر اور رات کے کھانوں پر تو یہ لوگ چاول ہی

چاول کھاتے ہیں۔"(۴۷)

صبح کے وقت کے علاوہ کشمیر کے دن اور رات کے اوقات کے کھانوں میں چاول اور گوشت زیادہ اہمیت کے حامل ہے۔ کشمیر چونکہ پہاڑی اور ٹھنڈا علاقہ ہے۔ گوشت کے ذریعے ہمیں پروٹین، وٹامن، لحمیات اور آئرن حاصل ہوتا ہے۔ جو جسم کو گرم رکھنے کے ساتھ ساتھ ہڈیوں کو مزید مضبوط بناتا ہے۔ کشمیر میں موسم سارا سال ہی ٹھنڈا رہتا ہے اس لیے یہ لوگ کھانے میں گوشت کا خاص اہتمام کرتے ہیں۔ کھانے کے منظر کو عزیز احمد نے ناول میں منفرد طرز سے یوں پیش کیا ہے:

"بڑی بڑی قابوں میں چاول دستر خوان پر چن دیئے گئے۔
چاولوں کے چوٹی دار ڈھیر پر چار طرف سینے کے گوشت کے
چار چربی دار تلے ہوئے ٹکڑے تھے۔ چار پتلے پتلے سرخ سیخ
کے کباب تھے اور مرچوں کا کچھ قورمہ تھا۔"(۴۸)

شادی کے موقعوں میں طعام کے انتظامات عام دنوں سے مختلف کیے جاتے ہیں۔ کشمیریوں کے ہاں طعام کے لیے ایسے دستر خوان موجود ہیں جن پر آداب طعام اور فارسی کے اشعار چھپے ہوتے ہیں یا پھر مقامی پھولوں اور درختوں کی خوبصورت تصویر نگاری کی ہوتی ہے۔ گاؤں میں عموماً کھانا نیچے بیٹھا کر کھلایا جاتا ہے۔ جس میں دیوار کے ساتھ مہمانوں کو بیٹھا جاتا ہے اور ان کے سامنے ہی دستر خوان لگایا جاتا ہے جن میں مقامی کھانوں کے مختلف لوازمات موجود ہوتے ہیں۔ کشمیر میں کھانے کے برتن بھی مقامی روایات کے مطابق ہوتے ہیں جس میں بیک وقت کئی لوگ کھانا کھاتے ہیں۔

"ایک ایک طبق چار چار آدمیوں کے لیے تھا۔ چار جگہ کباب،
شوربہ اور بوٹیاں تھیں۔۔۔ چاولوں کے لقمے کے ساتھ گوشت
کا پہلا نوالہ بسم اللہ کر کے منہ میں رکھا۔ نوکر چھوٹے چھوٹے
پیالوں میں دوسرے سالن دینے لگے۔ مٹر کا شوربہ، آلو کا

قورمہ، گوشتابہ، کوفتے، مرچوں کا سرخ قورمہ، ترکاری کا ساگ

اور آب گوشت۔"(۴۹)

کشمیری چائے پوری دنیا میں کشمیر کی خاص پہچان ہے۔ کشمیر میں چائے وہاں کے لوگوں کی مقبول ترین مشروب ہے۔ ہر موقعے میں اس مشروب کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ "نوجوان گروہ جو جو گنجفہ کھیل رہا تھا، نمکین گاڑھی کشمیری چائے کی پالیاں دے کے۔"(۵۰)۔ مقامی مشروب ہونے کے ساتھ ساتھ کشمیری چائے جسم میں حرارت پیدا کرنے کا اہم ذریعہ ہے یہ ہی وجہ ہے کہ وہاں کے لوگ اس کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔

لباس:

لباس بنیادی طور پر فرد کو ڈھانپنے کا ذریعہ ہے۔ لباس معاشی اور معاشرتی مقام وحیثیت کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ ثقافت میں لباس کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ لباس فرد کی سوچ اور اس کے خیالات کا عکاس ہوتا ہے۔ اگر فرد مذہب کو زیادہ اہمیت دیتا ہے اس کا لباس مذہب کے قوانین کے نزدیک ہو گا اسی طرح جو لوگ مقامی روایات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں ان کے ہاں مقامی روایات کے مطابق لباس زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ جغرافیہ اور قدرتی آب وہوا بھی لباس کے انتخاب میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ سرد علاقوں کے لوگ گرم لباس کا استعمال زیادہ کرتے ہیں جبکہ گرم علاقوں کے لوگ ٹھنڈے اور ہلکے لباس پہنتے ہیں۔

ناول "آگ" میں کشمیری ثقافت کو بتاتے ہوئے عزیز احمد نے کشمیری لباس کو پیش کیا ہے۔ کشمیر میں لوگ گرم لباس کا استعمال کرتے ہیں۔ کشمیر میں سارا سال موسم سرد رہتا ہے اس لیے لوگ زیادہ تر گرم کپڑوں کا استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ "جاڑوں میں پشمینے کا لبادہ اور اس کے اوپر کبھی ایک موٹا سا کمبل، کبھی توسہ اوڑھے رہتے۔ سفید سوتی کپڑے کا چغہ اور شلوار پہنتے۔"(۵۱)عورتیں عام طور پر "پھیرن" پہنتی ہیں جو ڈھیل ڈھیلا ہوتا ہے۔ عورتوں کی خوبصورتی کا نقشہ عزیز احمد نے یوں بیان کیا ہے:

"ننگے پیر، آفتابہ اٹھائے، وہ ندی کی طرف چلی جارہی تھی اور

ملمع کئے زیور اس کے سر اور کانوں سے لٹکے ہوئے چھن چھن

بج رہے تھے۔ دونوں کانوں میں کنواج تھے، کنجیوں کے لچھے
کی طرح، اور لچھوں میں پانچ پانچ کڑے تھے۔ دوریا آویزے
جن میں ملمع کئے گولے لٹک رہے تھے۔ کنواج اور دور کے
وزن سے کان پھٹ ہی پڑتے، اس لیے تالازر یعنی چاندی کی
ایک پتلی سی زنجیر دور کو پیشانی سے باندھتی تھی۔ وزن کے
ہاتھوں میں لنگن تھے جن میں دور دور شیشے کے سرخ اور
ہرے ٹکڑے جڑے ہوئے تھے۔ گلے میں مرجان کا ایک ہار
تھا اور نقش کی ہوئی گولیوں کا دوسرا ہار تھا۔ دونوں ہاتھوں میں
سات سات دانے تھے۔"(۵۲)

کشمیری عورتیں لباس کے ساتھ زیورات کا استعمال بھی کرتی ہیں۔ کشمیری ثقافت میں عورتیں کے لباس کے ساتھ زیورات کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ عورتیں زیادہ تر چاندی کے زیورات کا استعمال کرتی ہیں۔ جو ان کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔ "ان حوروں کے حسین سرخ وسپید چہرے چاندی کے بوجھل زیورات سے لدے ہوئے تھے۔"(۵۳)۔ یہ زیورات کئی قسم کے قیمتی پتھروں سے بنے ہوتے ہیں۔ جو تبت، لداخ اور ماوراءالنہر میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ان زیورات میں نیلم، یاقوت، فیروزے، لاجود، کرسٹل کی طرح کے قیمتی پتھر استعمال ہوئے ہوتے ہیں۔

" تبتی یاقوت ارزق اور لاجورد سے جڑی ہوئی انگوٹھیاں، بڑے
بڑے فیروزوں سے جڑی ہوئی پرانی زنگ آلود تبتی پہنچیاں،
ماوراءالنہر کے چاندی کے پتروں میں جڑے ہوئے زمرد کے
ہار شامل ہیں۔"(۵۴)

کشمیر میں ان زیورات کو خاصی اہمیت حاصل ہیں۔ سیاح کشمیر میں سیاحت کے دوران ان زیورات کو دیکھنے اور خریدنے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں۔ عورتوں کے علاوہ شادی بیاہ کے موقعے پر دولہا بھی بھاری اور کام ہوئے لباس کا استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح بارات میں شامل لوگوں کے لباس بھی ململ اور ریشمی کپڑے سے تیار کردہ ہوتے ہیں۔ "صدر کشمیری ریشمی کاڑھے ہوئے کام کا چغہ پہن کے دولھا بیٹھا۔۔۔ لمبے لمبے چغے پہنے ہوئے سروں پر صافے، کالی ڈاڑھیاں، حنائی ڈاڑھیاں، سفید ڈاڑھیاں ترشے ہوئے لب، کچھ لوگ پشمینے یا رفل کی شالیں اوڑھے ہوئے۔"(۵۵)

کشمیر میں مقامی لباس "پھیرن" کے علاوہ شلوار قمیض کا رواج بھی ہے۔ کچھ لوگ لباس میں شلوار قمیض کا استعمال کرتے ہیں اور کچھ ڈوگرے کپڑوں کے ساتھ لمبے کُرتے، چوڑی دار پاجامے اور اوڑھنیاں کا استعمال کرتے ہیں۔ تاہم "پھیرن" کا استعمال آج بھی کشمیر میں زیادہ کیا جاتا ہے۔

اعتقادی لحاظ سے ثقافتی مظاہر کا مطالعہ

مذہب:

مذہب ثقافت کا پہلا اور بنیادی جز ہے۔ ثقافت کے مقاصد طے کرتے ہوئے سب سے پہلے عنصر مذہب کو دیکھا جاتا ہے۔ جب بھی کوئی معاشرے کسی موضوع پر گفتگو کرتا ہے تو اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے مذہبی حوالہ دیتا ہے۔ یہاں تک کہ شادی اور موت کی رسومات بھی مذہب کے مطابق طے کی جاتی ہیں۔ مذہب معاشرے کی بنیاد رکھتا ہے۔ مذہب کے اصول و ضوابط کے مطابق معاشرے کے رہن سہن طے کیے جاتے ہیں۔ مذہب انسان کو دنیا میں منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ مذہب اسلام میں مسلمانوں کو کائنات کی تسخیر کرنے کے احکام دیے گئے ہیں۔ ثقافت کی تشکیل میں مذہب کا کردار نہایت اہم کا حامل ہے۔ وقت اور مذہب کی تبدیلی کے ساتھ ثقافت میں تبدیلی بھی آتی جاتی ہے۔

"مذہبی عقائد ایک طرح سے ایک معاشرتی تشریط کی صورت
ہیں جسے ہر فرد اپنی رضا، ترغیب یا معاشرتی خیر کے اصول کے
تحت قبول کرتا ہے۔ پھر اس کا یہ پہلو بھی ہے کہ ان اعتقادات کو

معاشرہ مجموعی طور پر قبول کرتا ہے اور توقع رکھتا ہے کہ معاشرے
کے ہم عقیدہ اور ہم مذہب افراد متفقہ دینی اقدار و معیار سے بغاوت
نہیں کریں گے۔ مذہب ثقافت کا بدل نہیں مگر اس کا ایک نہایت اہم
پہلو ضرور ہے۔"(۵۶)

ہر علاقے کا مذہب مختلف ہوتا ہے۔ اس لیے ہر علاقے کی ثقافت بھی ایک دوسرے سے مختلف نظر آتی ہے۔ مذہب کی اہمیت پر بات کرتے ہوئے میتھو آرنلڈ لکھتا ہے:

"مذہب جو انسان کی ان کوششوں میں جن کے ذریعے بنی نوع
انسان نے خود کو کامل بنانے کے جذبے کا اظہار کیا ہے، سب
سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ عظیم کوشش ہے لہٰذا مذہب
اور ثقافت دونوں ایک ہی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔"(۵۷)

عزیز احمد نے ناول میں کشمیری ثقافت پر اثر انداز ہونے والے مذہب کو تفصیلاً بیان کیا ہے جو نا صرف کشمیر کی تاریخ کا حصہ ہیں بلکہ اس کے ثقافت میں بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ کشمیر کی تاریخ کا آغاز بدھ مت کے مذہب سے ہوتا ہے۔ بدھ مت نے کشمیر سے اپنی تعلیم کا آغاز کیا اور یہاں سے پورے برصغیر میں پھیلے تھے۔ کشمیر کے علاقے "لداخ" میں بدھ مت کا مذہب زیادہ پھولا پھیلا ہے۔

"یہ لداخی تبت مارکہ کے بدھ مت کے قائل ہیں۔ "گن پا" جو
ان کی خانقاہیں ہیں، ان میں لاکھوں کا سونا ہے۔ ہر خاندان کسی نہ
کسی "گن پا" کو اپنا ایک لڑکا اور ایک لڑکی سپرد کرتا ہے۔ لڑکے
بڑے ہو کر لاما اور لڑکیاں کومو کہلاتی ہیں اور سب لاسا کے لامائے
اعظم کی معتقد ہوتی ہیں۔"(۵۸)

بدھ مت کے مذہب کے پھیلاؤ کے بارے میں عزیز احمد بتاتے ہیں کہ ہر گھرانے سے جو لڑکا اور لڑکی ان کے سپرد کیے جاتے ہیں وہ جوان ہو کر بدھ مت کی تعلیم کو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پھیلاتے تھے۔ بدھ مت کے بعد کشمیر میں ہندومت کا مذہب پھیلا۔ ہندومت کے لوگ کشمیر اور اس کی پہاڑیوں کو بہت مقدس سمجھتے ہیں۔ بادشاہ دارا شکوہ کے دور میں ہندومت کا مذہب کشمیر میں آیا۔ سکندر اعظم کے آمد اور بادشاہ داراشکوہ کی شکست کے بعد ہندومت کے مذہب کو کشمیر میں ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے البتہ آج بھی ہندومت کے مذہب کے آثار کشمیر میں نظر آتے ہیں۔

"مارتنڈ کے مندر کے ویرانے کو دیکھا، جہاں ہر طرف بت شکنی
کے آثار تھے۔ یہ کشمیر کا سومنات ہے۔۔۔ زلزلوں کے آثار اور
سکندر بت شکن کا تعصب، سب نے اس پرستش گاہ کی عظمت پر
ضرب لگانے کی کوشش کی تھی مگر دروازے اور کہیں کہیں اونچی
دیوار اور نقش و نگار اب بھی اس کی پرانی شان و شوکت کی تصویر
آنکھوں میں زندہ کر رہے تھے۔"(۵۹)

ہندومت کے مذہب کی حکومت کے بعد "امرناتھ" کے مذہب کا آغاز ہوا۔ کشمیر میں اس مذہب کی آمد نے یہاں کے قدرتی مناظر کی اہمیت کو اور بڑھا دیا تھا۔ موجود دور میں بھی ہر سال ہزاروں یوگی اور پجاری کشمیر کا رخ کرتے ہیں۔ امرناتھ کے مقدس عبادات کی تاریخ چاند کے بڑھنے اور گھٹنے پر مختص ہیں کیونکہ اس کے مقدس ایام قمری مہینے کے مطابق طے کیے جاتے ہیں۔ اس لیے ہر سال یہ دن بدل بدل کے آتے رہتے ہیں۔ کشمیر میں ان یاتروں کے لیے خاص مقام بنائے گئے ہیں جہاں وہ دوران عبادت قیام کرتے ہیں۔

"برف پوش چوٹیوں اور کھلے کھلے دیوداروں میں گھرا ہوا ایک
چھوٹا سا میدان، جس میں کبوتروں کے کابکوں کے قسم کے کئی
چوبی جھونپڑے تھے جو امرناتھ کے زائرین کے لیے بنائے گئے

تھے، کیونکہ یہیں سے پنج ترنی، شش رام ناگ اور دوادیاں

ہوتے ہوئے ہر سال سینکڑوں، ہزاروں یوگی اور پجاری امر

ناتھ کے مندر کی زیارت کو جاتے ہیں۔"(۶۰)

ہندو مت کے بعد کشمیر میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ مذہب اسلام پھیلا۔ حضرت بل اور سلطان زین العابدین جیسے صوفیاء نے اسلام کو کشمیر میں پھیلایا ہے۔

توہمات:

توہمات سے مراد وہ قصے کہانیاں ہوتے ہیں جو معاشرے کے لوگ کسی خوف یا خوشی کی وجہ سے فرض کر لیتے ہیں۔ ان کا نہ تو کوئی مذہب سے تعلق ہوتا ہے اور نہ معاشرے سے۔ انسان ہمیشہ فطرت سے کمزور رہا ہے۔ مذہب اسلام سے پہلے انسان کو جو چیز فائدہ دیتی تھی وہ اسے پوجنا شروع کر دیتا تھا اور جو چیز اسے نقصان دیتی یا جس سے ڈر لگتا، اسے بھی یہ خدا سمجھنا شروع کر دیتا تھا۔ کسی حادثے کو اچھا یا بُرا سمجھا کر اس کو ذہن میں بیٹھا کر اس سے خوف زدہ رہتا۔ مثلاً کالی بلی کے راستے کاٹنے کو بُرا خیال کیا جاتا ہے، اسی طرح کوے کے بولنے کو مہمانوں کی گھر آمد تصور کیا جاتا ہے۔ یہ سب توہم پرستی زمانہ جہالیت سے چلتی آرہی ہے۔ آج بھی ہر علاقے کی ثقافت کے ساتھ کچھ توہمات وابستہ ہے جن کا وہاں کے لوگ نہ صرف خیال کرتے ہیں بلکہ سختی سے اس پر عمل پیرا بھی ہوتے ہیں۔ کشمیر کی ثقافت میں بھی کچھ توہمات ایسی ہیں جو نسل در نسل آج تک کشمیر میں چلی آرہی ہیں۔ جن میں سے ایک توہم "بیساکھی" کے دن بارش کا ہونا ہے۔ بیساکھی سکھ مذہب کا ایک تہوار ہیں جسے مسلمان، ہندو، سکھ الغرض برصغیر پاک و ہند میں رہنے والا ہر انسان جو خواہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو اسے مناتا ہے۔ ہندو مذہب کے ماننے والوں کا عقیدہ ہے کہ بیساکھی پر بارش ضرور ہوتی ہے۔

"آج پنڈت لوگ کہتا ہے کہ بیساکھی کے دن کی وجہ سے بارش

ہو گی۔ بے شک ہم مانتا ہے۔ بیساکھی کے دن بارش ضرور ہوتی

ہے مگر ہم دین اسلام کا ہے جادو بر حق ہے۔ جادو کرنے والا کافر

ہی جناب خواجہ صاحب۔"[61]

بیساکھی والے دن ہندو اور پنڈت بڑی تعداد میں مقدس مقامات کی طرف جاتے ہیں۔ ہندومت میں ہمالیہ کی پہاڑیوں کو نہایت اہمیت حاصل ہے۔ ان کے عقیدے کے مطابق آج بھی ان کے دیوی دیوتا ہمالیہ کی پہاڑیوں پر موجود ہے۔ ہر ثقافت کی طرح کشمیر کی ثقافت میں بھی کچھ ایسی توہمات ہیں جو کشمیر کے ساتھ پورے ہندوستان میں پائی جاتی ہیں۔ کشمیر کے لوگ "دیوان حافظ" کو مذہبی کتاب کا درجہ دیتے ہیں اور اس سے مستقبل کا حال دریافت کرتے ہیں۔ فال کے اچھے اور برے ہونے سے اپنے مستقبل کے اچھے اور بُرے ہونے کا اندازلگاتے ہیں۔ "باخدا حضرت بڑا منحوس فال نکلا۔ کل سے میری بائیں آنکھ بھی پھڑک رہی ہے"[62] اس طرح کی توہمات عام طور پر دیہاتوں میں پائی جاتی ہیں۔ کسی بھی غیر معمولی چیز کو کسی خطرے کی گھنٹی سے یا خوشی سے خود ہی منسوب کر دیا جاتا ہے۔

اساطیر:

کسی خطے کی روایات اس خطے کی تاریخ سے جڑی ہوتی ہیں۔ فرد اپنی طاقت کے مظاہر کے لیے اپنے آباواجداد کے کارناموں کو بڑی فخر سے بیان کرتا ہے۔ ان کارناموں کے بیان میں انسان مافوق الفطرت عناصر کا استعمال عام طور پر کرتا نظر آتا ہے۔ اساطیر بنیادی طور پر "سطر" سے نکالا ہے۔

"اسطورہ یا میتھ یونانی زبان کے لفظ مائی تھوس سے ماخوذ ہے جس کا لغوی مفہوم ہے وہ بات جو زبان سے ادا کی گئی ہو۔ یونہی کوئی قصہ یا کہانی ابتدا اسطور کا یہی تصور رائج تھا۔ یوں کہ اسطور اس کہانی کا نام پایا دیوتاؤں کے کارناموں سے متعلق تھا یا ان شخصیتوں کی مہمات کو بیان کرتی تھی جو زمین پر دیوتاؤں کی نمائندگی کرتی تھیں۔"[63]

کشمیر میں ایک وادی "ستی سا" موجود ہے۔ اس علاقے میں مختلف اقسام کی اسطورہ پائی جاتی ہیں کہ وہ علاقہ دو خداؤں کے جھگڑے کی وجہ سے میدان بنا ہے۔ سالوں کی تحقیق یہ بات ثابت کی ہے کہ اس علاقے میں ایک عرصے تک لمبی جھیل موجود تھی بعد میں یہ علاقہ زمین کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

"ایک یوگی تھا جس کا نام کاشیپ تھا۔ اس نے اس جھیل کو خالی کر دیا اس نے رام پور کے پاس کی چٹانیں ہٹا کے جہلم کو اوڑی، دو میل، کوہالہ، جہلم، پنجاب کی طرف بہا دیا۔ اور یہ وادی میدان بن کے نکل آئی۔ جہلم بھی جھیل کے بجائے سوکھ کے ایک ندی رہ گئی ۔اس کاشیپ کے نام پر اس سرزمین کو لوگ کاسیپ پوریا کاشیپ مار کہنے لگے اور یہ کاشیپ مار گھٹ کے کاشمیر ہو گیا۔ (۶۴)

اسی علاقے کے ساتھ سے ایک راستے مانس بل اور دلر جھیل کو جاتا ہے جو کشمیر میں پرانی جھیل کے نام سے منسوب ہے۔ اس جگہ کو ستی سار مرحوم کی باقیات الصالحات بھی کہا جاتا ہے۔

منتخب اردو ناول "برف آشنا پرندے" میں ثقافتی مظاہر

"برف آشنا پرندے" ترنم ریاض کا ناول ہے۔ جو ۲۰۰۹ء میں بک کارپوریشن، دھلی سے شائع کیا گیا ہے۔ ترنم ریاض نے ناول میں کشمیری ثقافت کی بڑی تفصیل سے پیش کش کی ہے۔ اس ناول میں ترنم ریاض نے آزادی سے پہلے سے لے کر اکیسویں صدی تک کے ثقافت پر اثرات کو بیان کیا ہے۔ ترنم ریاض نے اپنے ناول میں شہری اور دیہاتی دونوں زندگیوں کا موازنہ کیا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں بھارت کے کشمیر پر قابض ہونے، بیسویں صدی کے آخری چار دہائیوں میں چلنے والی تحریکیوں اور اکیسویں صدی میں ہونے والی تبدیلیوں نے مقبوضہ کشمیر پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ جس کا عکس اس ناول میں نظر آتا ہے۔ انتخاب حمید لکھتے ہیں:

"اس ناول کے کینوس کی وسعت، مصنفہ کی وسیع النظری، ادراک

> کی گداختگی پلاٹ اسٹرکچر کے متوازی خطوط اور زوایے موضوعات و
> معنی کی تکثیریت، کرداروں کے متضاد رویے، حسن بیان کی لسانی
> جلوہ سازیاں ایسے اوصاف ہیں جو بھارت ہی نہیں بلکہ برصغیر میں
> ترنم ریاض کی پذیرائی پر داد ہے۔"(۶۵)

ناول کی کہانی مرکزی کردار "شبیا" کے گرد گھومتی ہے جو واحد متکلم کے ذریعے ساری کہانی کو بیان کرتی ہے۔ شبیا کا کردار اکیسویں صدی کا کردار ہے جو وقت کے ساتھ تبدیل ہوتی ثقافت کے اثرات کو محسوس کر رہا ہے۔ انہی اثرات کو ترنم ریاض نے اپنے ناول میں سمویا ہے۔ ناول کا لینڈ سکیپ مقبوضہ کشمیر کا ہے۔ اکیسویں صدی میں مقبوضہ کشمیر کا سب سے بڑا مسئلہ ہندوراج سے آزادی ہے۔

> "عصری مطابقت اس ناول کا اہم ترین وصف ہے۔ ترنم ریاض نے
> اُن مسائل پر بھی مباحث قائم کیے ہیں جو تیسری دنیا کے ادب کا
> ایک ناگزیر عصری پہلو تشکیل کرتے ہیں۔ معاشی فوقیت، ثقافتی
> آمریت اور نسلی عصبیت ان ڈسکورسیز کے بنیادی عناصر ہیں۔"(۶۶)

ناول میں کشمیر کی ثقافت سے تعلق رکھنے والی جزئیات کو تفصیلاً بتایا ہے۔ ترنم ریاض کی پیدائش کشمیر کی ہے ۔ آپ نے ابتدائی تعلیم بھی کشمیر سے حاصل کی۔ یہ ہی وجہ ہے کہ کشمیر کی ثقافت اور اس تنوع کی وجوہات کو بڑی باریک بینی سے آپ نے اپنے ناول میں بیان کیا ہے۔ ترنم ریاض نے اس ناول میں ثقافت کے بیان کے ساتھ کشمیر کے لوگوں کے حالات سے عالمی اداروں کو آگاہ کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ عالمی اداروں کو کشمیر میں ہونے والے مظالم کی طرف متوجہ کر سکیں۔

> "ترنم ریاض نے ان ہی حالات وواقعات کو صفحہ قرطاس پر لا کے
> کشمیریوں کے دکھ درد کی وکالت کرتے ہوئے عالمی برداری کو اس
> گھمبیر مسئلہ پر سوچنے کی ترغیب دی ہے اور ان کے ساتھ ہو رہی

زیادتیوں اور سچائی پر مبنی حالات اور واقعات کو عالمی برادری کے

سامنے سوالیہ انداز میں لایا ہے۔۔۔دوسری طرف اہل کشمیر کو بھی

یہ باور کروایا ہے وہ اپنی سرزمین کے ماحول، ثقافت، تہذیب، تمدن

کو تاریخ کے حوالے سے پہچانیں۔"(٦٧)

الف۔ مناظر فطرت کا مطالعہ: ثقافتی تناظر میں

فطرت ہماری زندگی کا لازمی جز ہے۔ ثقافت اور فطرت کا تعلق لازم وملزوم ہے۔ ثقافت پر فطرت نے روز اول سے اثر اڈالنا شروع کر دیا تھا۔ ثقافت کا انحصار گروہ پر ہوتا ہے اور یہ گروہ مل کر معاشرہ بنتا ہے۔ بظاہر ماحول اور معاشرہ منفرد چیزیں ہیں لیکن یہ دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ کسی بھی علاقے کی ثقافت میں اس علاقے کے خدوخال اور قدرتی مناظر کا ہاتھ ہوتا ہے۔ قدرتی مناظر یہ طے کرتے ہیں کہ ثقافت کے مقاصد کون سے ہوں گے۔ اس لیے یہ دیکھا گیا ہے کہ ہر علاقے کی ثقافت دوسرے علاقے سے مختلف ہوتی ہے۔ ڈاکٹر مظفر حسن ملک فطرت اور ثقافت کے تعلق کو یوں بیان کرتے ہیں:

"انسانی ذہن کی معراج کے ساتھ ساتھ تصورات حسن میں بھی

ارتقاء کا عمل جاری رہا ہے۔ تصورات بھی مجرد سے مقرون اور

کلاسیکی سے جدید کی منازل سے گزرتے رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں

جمال کا تجزیاتی اور تقابلی مطالعے کے ساتھ ساتھ ثقافتی اقدار کے

ارتقاء کی روشنی میں مطالعہ کرنا ہو گا اور اس کی نفسیاتی کیفیت کو مد

نظر رکھنا ہو گا خواہ وہ وقتی ہی کیوں نہ ہو جو کسی قدر کی فراہمی

کا باعث ہوتی ہے۔"(٦٨)

کشمیر کا خطہ اپنے قدرتی مناظر کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ کشمیر کا علاقہ جنت ارضی کے علامتوں مثلاً دریاؤں، نہروں، آبشاروں اور پہاڑوں کا عکاس ہے۔ لیکن زمانے کی تبدیلی اور ٹیکنالوجی نے کشمیر کی فطرت پر بھی اثر ڈالا ہے۔ ترنم ریاض کا بچپن چونکہ کشمیر میں گزرا ہے اس لیے ان کے ذہن میں کشمیر کی خوبصورتی کے تمام عنصر موجود ہیں۔ ترنم ریاض نے کشمیر کے علاقے "لداخ" کا بطور لینڈ سکیپ استعمال کیا ہے۔ لداخ اپنی پیچیدہ زمینی خدوخال کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ کشمیر کی خوبصورتی بیان کرتے ہوئے شہنشاہ جہانگیر لکھتا ہے:

> "کشمیر ایک باغ ہے۔ سدابہار، قلعہ ہے آہنی حصار۔ بادشاہوں کے لیے ایک گلشن عشرت افزا، درویشوں کے ایک خلوت کدۂ دلکشا ہے ۔ چمن خوش، آبشار دلکش۔ آب ہائے رواں شرح وبیان سے زیادہ اور چشمہ سار حساب وشمار سے باہر ہیں۔ بہار میں کوہ ودشت اقسام شگوفہ سے مالامال۔ درودیوار اور صحن وبام گھروں کے مشعل لالہ سے بزم افروز ہیں۔"(۶۹)

کشمیر کی جھلیں کشمیر کی قدرتی مناظر کی سب سے بڑی مثالیں ہیں۔ دنیا سے آنے والے لاکھوں سیاح کشمیر کو طلسماتی جھیلوں کی سرزمین کہتے ہیں۔ یہ قدرتی مناظر نہ صرف کشمیر کی خوبصورتی کا باعث ہے بلکہ یہ جھیلیں پورے ہندوستان میں پانی کی فراہمی کا باعث بنتی ہیں۔ ترنم ریاض نے کشمیر کو "مشرق کا وینس" کہا ہے۔

> "اس میں پھل دار باغ، دھان کے کھیت، زعفران کی معطر کھیتیاں ، گھنے صحت مند جنگل اور پھول اور سبزیاں دینے والی جھیلیں تھیں۔ زمینیں تو پھل پھول اُگایا ہی کرتی ہیں مگر سبزیاں اور پھول اُگانے والی اس کی بے مثال جھیلیں کسی عجوبے سے کم نہیں۔"(۷۰)

برف کے پگھلانے کے مناظر کشمیر کی خوبصورتی کو مزید چار چاند لگاتے ہیں ۔ اس خوبصورتی کو دیکھنے کے لیے ہزاروں افراد کشمیر کا رخ کرتے نظر آتے ہیں۔ ترنم ریاض نے کشمیر میں بہار کے موسم میں وقت کی تبدیلی اور برف کے پگھلانے کے مناظر کو بیان کرتے ہوئے دل مو لینے والے مناظر پیش کیے ہیں:

"اس روز دھوپ سارا دن چمکتی رہی تھی۔ بادل کا کوئی ٹکڑا سورج
کے راستے میں نہیں آیا تھا۔ برف چھتوں، سے درختوں کی سوکھی
ٹہنیوں اور خزاں زدہ پودوں سے پگھل پگھل کر قطرے بن رہی تھی
۔ ہوا بہت تیز چلتی تو قطرہ تصویروں میں بننے والے قطرے کی الٹی
شکل میں ٹنگا رہ جاتا۔ مگر دھوپ کی تیزی آخر اس قطرے کو پگھلنے
پر مجبور کر دیتی۔"(۷۱)

ایک اور جگہ برف کی خوبصورتی کو مچھروں سے تشبیہ دیتے ہوئے ترنم ریاض لکھتی ہیں:

"پہاڑی سلسلہ شروع ہوتے ہی برف گرتی نظر آئی۔ کبھی مہین تو
کبھی بڑی بڑی سی۔ مہین بھی اتنی کہ جیسے مچھروں سے بھی چھوٹی
مخلوق ہوا میں اڑ رہی ہو اور کسی وقت ایسے موٹے موٹے گالے ایک
ہی سمت ایسے اڑتے جاتے جیسے ابو روٹی کے ننھے ننھے ٹکڑے بنا کر
کبوتروں والے چبوترے کی طرف اُچھالا کرتے تھے۔"(۷۲)

کشمیر کی خوبصورتی کی ایک وجہ کشمیر کے بلند و بالا چناروں کے درخت ہے۔ چنار کے درخت کشمیری ثقافت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ کشمیر میں یہ درخت قدرتی مناظر کے ساتھ ساتھ مذہبی اور ماحولیاتی لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں۔ چناروں کے درخت دن کے وقت سایہ فراہم کرتے ہیں جبکہ رات کے وقت چاند کی روشنی پڑتی ہے تو یہ سلگتے ہوئے پتے ایک حسین امتزاج پیش کرتے ہیں۔ موسم کے ساتھ چنار کے درخت سرخ رنگ میں تبدیل ہو جاتے ہیں جو

کشمیر کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔ "چناروں نے ہر طرف گہرے گہرے سائے رکھے تھے۔ خزاں کی آمد سے چناروں کے سارے پتے نارنجی ہو گئے تھے۔"(۷۳) فطرت کے بیان کے مختلف رنگ ترنم ریاض نے اپنے ناول کا حصہ بنائے ہیں۔ "حنائی، غازہ، ہریالی، قرمزی، نارنجی خوبانی سی زرد، آلو بخارے سی کاسنی، گلاب سا" الغرض خوبصورتی کے مناظر کی ایک طویل فہرست اس میں موجود ہے۔ ہر رنگ منفرد کہانی کو بیان کرتا ہے، کہیں یہ کہانی میں استعارہ کے طور پر استعمال ہوا ہے اور کہیں حقیقت میں اپنا رنگ ظاہر کرتا ہے۔ یہ رنگ وقت کی تبدیلی کو ظاہر کرتے ہیں۔ بدلتے ہوئے رنگ فطرت کے مصائب کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان مصائب کے دنیا پر اثرات بھی ترنم ریاض اپنے ناول کا حصہ بناتی ہیں:

"پھر دُور کسی ان دیکھی دنیا سے کوئی نظر نہ آنے والا دست حنائی
ہمہ رنگ مو قلم لئے اس کے باغوں کو فردوس سے مشابہ رنگوں
سے رنگ کر اسے خوشبوؤں کے سپرد کر دیتا ہے تو گونا گوں پرندوں،
پتوں اور پھولوں کی بہار دیدنی ہوتی ہے اور اس کے بعد نرم گرم
ہوائیں دھان کے خوشوں سے سر گوشاں کرتی اور سرسوں اور تلہن
کو بسنت بخشی۔۔۔ ہرے اور ریشمی گیسوؤں سے معطر قطروں کی
صورت ٹپکتی انسانوں کو شاعر بنا دیتی ہے۔"(۷۴)

ترنم ریاض ناول میں کشمیر کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ کشمیر کی عوام کو درپیش مسائل کو بھی اجاگر کرتی ہیں۔ ان مسائل میں حکومت کی طرف سے پیدا کیے جانے والے مسائل کے ساتھ ساتھ قدرتی مسائل کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ اکیسویں صدی میں جب دنیا ایک گاؤں کی صورت اختیار کر چکی ہے، اب بھی برصغیر کے کئی ایسے علاقے موجود ہیں جہاں قدرتی مناظر اپنی مثال آپ ہیں، لیکن مقامی اور عالمی ادارے ان کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے کے لیے کوئی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ ان علاقوں میں سے ایک علاقہ کشمیر کا بھی ہے، جو قدرتی مناظر سے تو مالا مال ہیں لیکن متنازعہ

علاقہ ہونے کی وجہ سے بھارت کا اس سیاحتی مقام کی خوبصورتی کے لیے کوئی قابل ذکر کام موجود نہیں ہے۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ترنم ریاض لکھتی ہیں:

"یہ خطہ بلاشبہ دنیا کا حسین ترین خطہ ہے، پہاڑوں میں چھپے ایک کثیر رنگ خود و پھول کی طرح۔ جس کی نوک پلک صرف موسم نے سنواری ہے۔ اسے یورپ، امریکہ، وسط ایشیا یا ہندوستان کے دوسرے پہاڑی علاقوں کی طرح کسی نے کھربوں روپے خرچ کر کے سجایا نہیں۔"(۷۵)

ثقافت اور تاریخ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ثقافت تاریخ کی عکاس ہوتی ہے۔ جو واقعات، اقدار اور رسوم ورواج ماضی میں قوم نے اختیار کیے ہوتے ہیں، اس سے ثقافت نئی نسل کو حال میں روشناس کرواتی ہے۔ تاریخ جہاں ثقافت کو بنیاد فراہم کرتی ہے وہیں ثقافت تاریخ کے تجربات سے نئی نسل کو روشناس کر کے آئندہ لائحہ عمل میں مدد بھی فراہم کرتی ہے۔ ثقافت ہمیشہ ماضی کے معاشرتی اور سیاسی حقیقتوں کی عکاس ہوتی ہے۔ تاریخ ثقافت میں آنے والے تنوع کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ کسی بھی ثقافت میں تبدیلی کی بنیادی وجوہات، قوموں کے حالات وواقعات، دنیا کے اثرات تاریخ سے ہی جانے جاسکتے ہیں۔ یہ سب عنصر ثقافت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی بھی ثقافت کو سمجھنے کے لیے اس علاقے یا قوم کی تاریخ کا علم ہونا لازم ہے۔

"ثقافت کا تاریخ سے رابطہ تو بہت گہرا ہے کیونکہ اس کا سب سے بڑا موضوع بنی نوعِ انسان کا ارتقا ہے اور یہ عہد کی تاریخ کی اکائیوں کو باہم مربوط کر کے صفحہ ہستی پر لاتی ہے۔"(۷۶)

باب کے ابتدائی صفات میں کشمیر کی تاریخ کو بیان کیا جا چکا ہے کہ کشمیر کی تاریخ قبل عیسوی سے شروع ہوئی۔ اس تاریخ نے نہ صرف قدرتی مناظر پر اثرات مرتب کیے ہیں بلکہ اس کی ثقافت کو بھی متاثر کیا ہے۔ چونکہ ہر قوم کی اپنی کوئی نہ کوئی ثقافت ہوتی ہے اور جب ایک قوم کسی دوسری قوم پر حملہ آور ہوتی ہے تو اپنی ثقافت کے اثرات چھوڑتی

ہے۔یوں علاقے کی ثقافت میں تنوع پیدا ہوتا ہے۔ترنم ریاض اپنے ناول "برف آشنا پرندے" میں کشمیر کی تاریخ کے بارے میں لکھتی ہیں:

"نرم خو، حلیم اور حسین کشمیریوں کی زمین، دانشوروں، فن کاروں
اور دستکاروں کا خطہ، ریشم و پشم، زعفران زاروں اور مرغزاروں کی
سرزمین پہاڑیوں، پانیوں اور وادی کا مسکن یہ کشمیر۔ جنت بے نظیر۔
جس کی پانچ ہزار سال پرانی تاریخ موجود ہے جس کی مثال شاید ہی
دنیا میں کہیں ملے۔"(۷۷)

ناول میں ترنم ریاض نے کشمیر کی تاریخ کا آغاز پانچ ہزار پہلے سے کیا ہے۔ترنم ریاض کے مطابق موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کا مسکن بھی کشمیر رہ چکا ہے جس کے اثرات اور کھنڈرات پورے علاقے میں موجود ہے۔اس کے علاوہ راجہ کنشک نے بھی کشمیر کو اپنی آرام گاہ بنایا۔ یہاں سے ہی بدھ مت کی تعلیم کا آغاز ہوا۔بدھ مت کشمیر کے علاقے سے ہی اپنی تعلیم پورے ہندوستان میں پھیلتے رہے۔یہودی بھی کشمیر کے راستے ہی ہندوستان میں داخل ہوئے۔یہودی قبائل سکندر اعظم کے ساتھ ۳۲۷ قبل مسیحی میں ہندوستان میں داخل ہوئی۔

"سکندر اعظم کے ہمراہ وارد ہوئے کچھ یہودی قبائل کے ساتھ
وادی پہنچے۔۔۔کشمیر کے کئی مقامات کے نام یہودی ناموں سے
ملتے جلتے ہیں۔کشمیری پنڈت فرقے کے لوگ ان سے نسبتاً بہت
حد تک مماثلت رکھتے ہیں۔"(۷۸)

کشمیر میں موجود دریائے نیل کے قریب کئی سلطنتیں آباد ہوئیں۔ان میں سے زیادہ تر آبادی ان لوگوں کی تھی جو کشمیر پر حملہ آور ہوئے۔ آج بھی کشمیر میں اس دریا کو تاریخی اہمیت حاصل ہے۔اس کے کنارے تنزانیہ، روانڈہ، یوگینڈا، سوڈان، ایتھوپیا جیسی سلطنتیں آباد ہوئیں۔اس دریا کے قریب متعدد بار جنگیں ہو چکی ہیں۔کشمیر کی تاریخ میں

اس دریا کے ساتھ کئی روایات وابستہ ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ لوگ یہاں کسی خفیہ راستے کی تلاش میں آئے تاکہ خزانے کو لوٹا جاسکے جبکہ کچھ لوگ یہاں صرف تجارت کی غرض سے آئے تھے۔

"کچھ اہم اذکار اور بیانات بھی مصر کی تاریخ سے جڑے ہیں،
جس پر صدیوں تک مقدونیائی نسل کے شاہوں کی حکومت
تھی جن کا ایک اہم شاہد عظیم اور قدیم دریائے نیل بھی ہے۔"(۷۹)

چودھویں صدی میں مسلمانوں نے کشمیر میں قدم رکھا۔ مسلمانوں نے اپنی ثقافتی روایات کے علاوہ اس علاقے کی خوبصورتی میں بھی اضافہ کیا۔ زیادہ تر مسلمان رہنماؤں نے کشمیر میں مذہب کی ترسیل میں اپنا حصہ شامل کیا ہے، جس کی وجہ سے ہمیں ۱۴ اویں صدی کے بعد کشمیر کی ثقافت میں اسلامی عکس نظر آتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کی ترسیل کے علاوہ مسلمان رہنماؤں نے علاقے کی خوبصورتی کے لیے مختلف جگہوں میں باغ تعمیر کروائے۔

"بارہ سو کے قریب چنار کے درختوں کا باغ نسیم شہنشاہ اکبر نے
صدیوں پہلے ۱۵۸۶ء میں ڈل جھیل کے کنارے بنوایا۔۔۔ باغ
کے کناروں پر لکڑی کے کوئی درجن بھر یک منزلہ مکان تعمیر
کئے گئے تھے۔ کشمیر کی سرزمین پر مغلوں کا تعمیر کردہ پہلا باغ
یہی ہے۔"(۸۰)

مسلمانوں کی حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی سکھوں نے کشمیر میں اپنی حکومت قائم کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ تک پورے ہندوستان میں انگریز قوم پھیل گئی اس وقت کشمیر کے راجہ گلاب سنگھ پر انگریزوں نے دباؤ بڑھایا کہ وہ لاہور پر قبضے میں انگریزوں کی مدد کرے۔ جس کے نتیجے میں انگریزوں نے کشمیر کے راجہ کو کشمیر تحفے میں دے دیا۔ کچھ روایات کے مطابق کشمیر کو راجہ نے پچھتر ہزار کے عوض انگریزوں سے خرید اتھا جبکہ کوئی دستایزوی سند اس حوالے سے تاریخ میں موجود نہیں ہے۔ قبضے کے ساتھ ہی راجہ کشمیری عوام کے جسم وجان اور سرزمین کا مالک بن گیا۔ اس کے ساتھ کشمیری عوام پر مظالم شروع ہو گئے تھے۔

> "اس ظلم و جبر کے خلاف اس معصوم خلق نے تنگ آمد بہ جنگ آمد
> کے مصداق جب ایک بار ایک اجتمائی جلوس نکالا تو اس میں شامل
> شال بافوں اور کاریگروں کو گھوڑوں کے سموں تلے کُچلوایا گیا تھا۔
> دریائے جہلم میں پھینک دیا گیا تھا۔ جلوس پر بندوق کی گولیاں نہیں
> چلائی گئیں بلکہ بندوق کو لاٹھیوں کی طرح استعمال کر کے اتنا زد و
> کوب کیا گیا کہ لوگ بلبلاتے کراہتے دم توڑ گئے۔"(۸۱)

راجہ گلاب سنگھ کے بعد ان کے ماتحت راجہ ہری سنگھ جو کشمیر کا راجہ بنا تھا، نے بھی انگریزوں کا ساتھ دیا۔ تقسیم ہندوستان کے وقت جب یہ حکم جاری کیا گیا تھا کہ جو ریاستیں راجاؤں کے پاس ہیں وہ کسی بھی ایک ملک کا حصہ بن سکتے ہیں یا اپنی آزاد ریاست قائم کر سکتے ہیں۔ تو کشمیر کی عوام پاکستان کا حصہ بننا چاہتی تھی لیکن اس وقت کے کشمیری راجہ ہری سنگھ نے کسی ملک میں بھی شمولیت کو ٹالتے رہے۔ کشمیر کو کسی ملک میں شمولیت اختیار کرنے کے لیے آمادہ کرنے لیے لارڈ ماؤنٹ بیٹن بھی کشمیر تشریف لائے لیکن کشمیری راجہ اس بات پر آمادہ نہ ہوئے۔

> "ہندوستان کے وزیر داخلہ دلبھ بھائی پٹیل نے یہاں تک اعلان کر دیا
> کہ اگر مہاراجہ ہری سنگھ ریاست جموں و کشمیر کا مملکتِ پاکستان میں
> انضمام چاہتے ہیں تو مملکت ہند کو کوئی اعتراض نہ ہو گا لیکن مہاراجہ
> تھے کہ زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد۔ حقیقت یہ تھی کہ مہاراجہ ریاست
> جموں و کشمیر کو ایک آزاد مملکت کی شکل میں قائم رکھ کر اس پر مکمل
> اور دوامی حکمرانی کے خواب دیکھ رہے تھے۔"(۸۲)

کشمیر کی عوام نے قیام پاکستان کے بعد شیخ محمد عبد اللہ کو اپنا رہنما بنایا اور کشمیریوں نے انہیں "شیر کشمیر" کا لقب دیا۔ کشمیر کی عوام کا تقاضا تھا کہ عوام کو خود اپنے لیے رہنماؤں کا انتخاب کرنے دیں۔ لیکن راجہ سنگھ ابھی بھی اس

معاملے میں پس و پیش سے کام لے رہا تھا۔ کشمیری رہنماؤں نے اپنی عوام کی حفاظت کا ذمہ اٹھایا۔ دونوں ممالک کی فوجیں جموں کشمیر میں داخل ہو گئیں۔ برطانیہ کی مداخلت سے جنگ بندی کی گئی اور جموں و کشمیر دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ کشمیر کا علاقہ پاکستان کے پاس جبکہ جموں کا علاقے پر ہندوستان قابض ہو گیا تھا۔

"صوبہ جموں میں ایک لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا گیا ہے۔
اس سے دوگنی تعداد کو جموں و کشمیر کے پاکستانی کنٹرول والے علاقے
میں دھکیل دیا گیا ہے۔ صوبہ جموں جو ایک مسلم اکثریت والا صوبہ
تھا، اب ایک مسلم اقلیتی صوبے میں تبدیل ہو گیا تھا۔"(۸۳)

اب تک کشمیر کو بنیاد بنا کر دونوں ممالک تین بڑی جنگیں لڑ چکے ہیں۔ کہیں دفعہ عالمی سطح پر معاہدہ کی کوشش کی گئی لیکن آج بھی یہ مسئلہ حل طلب ہے۔ تاریخ پر نظر دہرائی جائے تو مسلمانوں کے دور میں سے ہی کشمیر کی عوام پر کوئی نہ کوئی ریاست یا حکمران قابض رہا ہے۔ ان محکوم قوم میں ناصرف غیر مسلم بلکہ مسلمان قومیں بھی شامل ہیں۔

"کشمیری محکوم ہی رہے۔ صدیوں۔۔ دیکھا جائے تو وادی کا سنہرا
دور سلطان زین العابدین کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔ یوسف شاہ چک
کے مغلوں کے ہاتھوں فریب سے گرفتار ہونے کے بعد کشمیر پر
کشمیریوں کی حکومت رہی ہی نہیں۔ پہلے مغل تھے۔ پھر افغانستان
سے افغانوں نے آکر مظالم توڑے۔ کشمیری کو غیر قوم سمجھ کر
تکالیف دیں۔"(۸۴)

آج بھی کشمیر کی عوام اپنے حق کے لیے لڑ رہی ہے۔ کشمیری ثقافت پر اس کی تاریخ نے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ خاص طور پر ہندوستان کی تقسیم اور اکیسویں صدی کے تقاضوں نے کشمیری ثقافت پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ ترنم ریاض نے اس ناول میں قیام پاکستان کے بعد کی تاریخ کے کشمیری ثقافت پر اثرات کو واضح کیا ہے۔ کشمیری

ثقافت پر کئی قوموں کے اثرات موجود ہیں۔ جدید دور میں مقبوضہ کشمیر کی ثقافت پر زیادہ اثرات ہندوؤں کے نظر آتے ہیں۔ انتخاب حمید لکھتے ہیں:

"برفیلے تقدس پر کالی برف، باغ عدن میں سانپ یعنی سیاست اور ملیٹنسی کی مداخلت کے مترادف ہے۔ اس مداخلت کو منتج تباہ کاریاں نہ صرف کشمیر بلکہ عالم انسانیت کے لئے باعث شرم ہے۔ یہ تباہ کاریاں کشمیر کے ایسے المناک سوالات ہیں جن سے انکھیں چار کرتے ہوئے دنیا تھرا رہی ہے۔"(۸۵)

ب۔ جغرافیائی لحاظ سے ثقافتی مظاہر

کسی بھی علاقے کا جغرافیہ اس علاقے کی ثقافت میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جغرافیے سے مراد وہ حدود بندی ہے جو ایک علاقے کو دوسرے علاقے سے الگ کرتی ہے۔ جغرافیہ اور تاریخ کسی بھی علاقے کی ثقافت پر اندرونی اثرات مرتب کرتے ہیں۔ "ہر قوم کی ثقافت کی تشکیل میں اندرونی عوامل کے ساتھ ساتھ بیرونی اثرات کا بھی دخل ہوتا ہے۔ اندرونی عوامل میں کسی قوم کے جغرافیے اور تاریخ کی کارفرمائیاں آسانی سے دیکھی جاسکتی ہیں۔"(۸۶) جغرافیائی صورت حال سے مراد پہاڑ، دریا، سمندر، جنگل، آب وہوا وغیرہ ہے۔ جغرافیے کو مدنظر رکھتے ہوئے ثقافت طے پاتی ہے۔ پہاڑی علاقے میں رہنے والے لوگ اپنے علاقے کے جغرافیے کے لحاظ سے رہن سہن، بول چال اختیار کرتے ہیں۔ وزیر آغا اپنی کتاب "کلچر کے خدوخال" میں لکھتے ہیں:

"کلچر تو ایک خاص خطہ زمین میں موجود مختلف عناصر کی آمیزش اور آویزش سے خودبخود ایک خاص رنگ اختیار کر رہا ہے۔ ان عناصر میں ہوا، پانی، موسم، زمین کی خاصیت اور خون کا گروپ، یہ سب چیزیں شامل ہوتی ہیں، لہٰذا کسی خاص خطہ زمین کے کلچر

کو جغرافیے کے ذریعے سے دوسری ثقافتوں سے جدا کر کے

دکھانا ممکن ہے۔"(۸۷)

کشمیر اپنے جغرافیہ کے اعتبار سے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔جیسا کہ باب میں پہلے بتا چکا ہے کہ کشمیر کو چاروں طرف سے سنگل پہاڑوں نے اپنے حصار میں لے رکھا ہے ترنم ریاض نے اپنے ناول کے لیے لینڈ سکیپ" لداخ" کے علاقے کا رکھا ہے جو جموں کشمیر کی ریاست ہے۔لداخ وادی کشمیر کی مشرقی وادی ہے۔ریاست کے اس حصے کی بلندی سمندر سے ۲۶۴۰ سے ۴۶۱۵ میٹر تک ہے۔قراقرم کے سلسلے لداخ کی شمالی سرحد بناتے ہیں۔بیرن چارلز ہیو گل نے اپنی کتاب "سیاحت نامہ کشمیر و پنجاب" میں کشمیر کا جغرافیہ منفرد انداز میں لکھا ہے:

"یہ ہمالیہ کے بلند ترین کوہستانی سلسلے سے ۳۵ درجے عرض بلد

شمال سے لے کر ۲۸ درجے تک پھیلی ہوئی ہے اور پھر طول بلد

کے لحاظ سے گرینج سے مشرق ۷۰ ویں درجے سے ۷۹ درجے

تک چلی جاتی ہے۔جنوب اور جنوب مشرق میں اس کی سرحدیں

دریائے ستلج اور دریائے گھارا تک ہیں اس کے شمال مشرق، شمال

اور شمال مغرب میں ہمالیہ کی نا قابل عبور چوٹیاں سر بلند ہیں اور

سلسلہ کوہ ہندو کش واقع ہے۔"(۸۸)

کشمیر کے حدود کا تعین کرتے ہوئے "برف آشنا پرندے" میں ترنم ریاض لکھتی ہیں:

"ان کے زیرِ علاقہ گاؤں کے بعد سرحدی علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔۔۔

اس کی مشرق کی جانب جو سرنگ نما طویل اور ناہموار اور تقریباً نا قابل

تسخیر سا مشکل راستہ ہے وہ جا کر ملک روس سے ملتا ہے۔"(۸۹)

ایک اور جگہ ترنم ریاض کشمیر کے عرض وبلد کا احاطہ کرتے ہوئے علاقوں کے نام سے یوں حدود طے کرتی ہیں:

"ٹنل کی اس طرف کی دنیا۔۔۔پٹھان کوٹ، جموں، لدھیانہ، کپور تھلہ وغیرہ۔ کچھ افغان علاقے، کچھ پاکستانی شہر، کابل، مزار شریف ، جہلم، کوئٹہ، راول پنڈی، گجرانوالہ وغیرہ، بلکہ کچھ وسط ایشیائی خطے بھی جیسے سمرقند، دوشنبے، تاشقند۔"(۹۰)

ترنم ریاض نے کشمیر کا جغرافیائی حدود بندی ۱۹۴۸ء میں ہونے والی پاک بھارت جنگ بندی کے بعد کے جغرافیے کے تحت کی ہے۔ ۱۹۴۸ء میں جنگ بندی ہونے کے بعد کشمیر کے آدھا علاقہ پاکستان کے حصے میں آ گیا تھا جبکہ دوسرے علاقے پر بھارت قابض ہے۔ کشمیر کی تقسیم کے بعد جو جغرافیائی لحاظ سے تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ان تبدیلیوں کے اثرات ثقافت میں بھی نمایاں ہیں۔

بودوباش:

کسی خاص جگہ، ملک کے رہن سہن کے طریقے اس کی بودوباش کہلاتے ہیں۔ بودوباش کا تعلق علاقے کی خارجی زندگی سے ہوتا ہے۔ بودوباش پر اثرات اندورنی اور بیرونی دونوں ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی علاقے کے رہن سہن میں تبدیلی اس علاقے کے جغرافیے اور تاریخ کے لحاظ سے بھی ہو سکتی ہے جو ثقافت کے اندرونی اثرات میں سے ہے اور کسی دوسرے ملک کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ بودوباش میں علاقے کے رہن سہن کے ساتھ ساتھ لباس، رسومات بھی شامل ہوتے ہیں۔ اگر علاقے کے لوگ پہلے یک منزلہ عمارتیں بناتے تھے لیکن بعد میں کسی سیلولیزشن کے تحت ہونے اور ثقافت میں تنوع آنے کی وجہ سے لوگ دو منزلہ یا تین منزلہ عمارتیں بنانا شروع کر دیتے تو یہ ثقافتی تنوع کے اثرات ہیں۔ مختلف علاقوں کی بودوباش میں وہاں کے مذہب کا گہرا اثر موجود ہوتا ہے۔ وہاں کے لوگ ان اثرات کو قبول کرتے ہیں اور اس کو قائم رکھنے کی حتی المقدور کوشش کرتے ہیں۔

کوئی بھی شخص معاشرے میں تنہا زندگی گزر نہیں سکتا۔ اسے زندگی گزرنے کے لیے کچھ لوگوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ ہی لوگ مل کر معاشرہ بناتے ہیں۔ جب سے انسان نے شعور حاصل کیا اور معاشرے میں رہنے کے ادب سیکھے ہیں تب سے ہی بودوباش کے طریقے طے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ایک ہی علاقے کے لوگ جب ایک ساتھ

رہتے رہتے کچھ اصول طے کر لیتے ہیں اور سب متفق طور پر اس کو اپنا لیتے ہیں تو آہستہ آہستہ یہ رہن سہن کے طریقے اس علاقے کی ثقافت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

"مزاج کی ہم آہنگی، عادات و اطوار، لباس، کھانے پینے، اٹھنے
بیٹھنے، رسم و رواج اور عقائد و زبان کی یکسانیت کی وجہ سے یہ
محسوس کرنے لگتے ہیں کہ وہ صرف اسی معاشرے میں سکون
اور طمانیت کے ساتھ زندگی گزر سکتے ہیں فکر و عمل کا یہی روحانی
رشتہ جو مشترک روایات کی بنیادوں پر مشترک طرز زندگی کا
موجب بنتا ہے، اس معاشرہ کا کلچر کہلاتا ہے۔"(۹۱)

بعض اوقات معاشرہ ایک بود و باش اختیار کر لیتا ہے لیکن وقت کی تبدیلی کے ساتھ اس میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔یہ تبدیلی کئی بنیادوں پر ہوتی ہے۔ بود و باش کی تبدیلی کی بڑی وجہ ایک ہی علاقے کی دو حصوں میں حد بندی کرنا ہے جس سے آہستہ آہستہ دونوں علاقوں کی ثقافت ایک دوسرے سے مختلف ہوتی جاتی ہے۔ترنم ریاض نے ناول "برف آشنا پرندے" میں مقبوضہ کشمیر کی بود و باش کی عکاسی کی ہے۔

ترنم ریاض نے ناول میں کشمیر کے رہن سہن پر انگریزوں کی حکومت، ہندوستان کی تقسیم اور اکیسویں صدی کے اثرات کو بتایا ہے۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ مسلمانوں نے کشمیر کے ثقافت پر گہرے مذہبی اور ثقافتی اثرات چھوڑے ہیں۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہ علاقہ بدھ مت سے متاثر تھا جس کی طرز پر مکانات کی تعمیر کی جاتی تھی۔

"سب سے بڑی نچلی چھت کے چاروں گوشوں کے ساتھ آویزاں
کمال مہارت اور فن کاری سے تراشے گئے چوبی جھومر، جیسے کنول
کے پھول چھت کے ہر کونے کے ساتھ لگے الٹے لٹک رہے ہوں۔
چینی بودھ دہاروں جیسی طرز تعمیر سے متاثر اس طرح کی عمارت

لداخ سے ہوتی ہوئی ریاست میں خاصی رائج رہی تھیں۔"[92]

ترنم ریاض نے ناول میں بیسوی صدی اور اکیسویں صدی کے اثرات کو مرکز بنایا ہے۔ مسلمانوں کی ثقافت کے بعد ہی انگریزوں نے حکومت کی۔ اس وقت انگریز پورے ہندوستان میں پھیلے تو دوسری قوموں کی طرح انگریزوں نے بھی اپنے اثرات مرتب کیے۔ پہلے مکانات کی طرز تعمیر مسلمانوں کی طرز پر ہوتی تھی، لیکن انگریزوں کی آمد کے بعد کشمیر میں مکانات کی طرز تعمیر وکٹوریہ انداز میں ہونے لگی۔

"والد بزرگو نے سبھی تمناؤں اور بہت سی محنتوں اور محبتوں
سے تعمیر کروایا تھا۔ یہ بنگلہ وکٹوریں انداز میں۔ چمنیوں اور
ستونوں والا، جس کی سامنے اور عقب کی جانب آٹھ آٹھ
کمروں اور طویل غلام گردشوں والی تین تین منزلیں تھیں اور
اوپر لکڑی کی وسیع بالادری تھی۔ جس کی چھ کی چھ منزلوں کے
زینے پتھروں کی ایک ایک سل سے بنے تھے اور واحد جس کی
پُرشکوہ چھت پر لگا ٹین برس ہا برس، دھوپ سے منعکس ہو کر
اپنے علاقے کے باہر بھی میلوں دور تک نظر آتا۔"[93]

کشمیر میں عمارت کی طرز تعمیر میں فرق آگیا ہے البتہ ابھی بھی مسلمانوں کے فنون لطیفہ کو مختلف طریقوں سے استعمال کیا جاتا تھا۔ مختلف ثقافتی اشیاء بنائی جاتی تھی۔ جو نا صرف کشمیری ثقافت کی نمائندہ ہیں بلکہ خوبصورتی کو بڑھا نے میں مدد گار ثابت ہوتی تھیں۔ مختلف چیزوں پر مصوری اور تصویر نگاری کا کام کیا جاتا تھا جسے مسلمانوں نے سب سے زیادہ بر صغیر میں فروغ دیا تھا۔ ناول میں ترنم ریاض حقہ، صراحی اور تانبے سے بنے مختلف برتنوں کا ذکر کرتی ہیں جس میں چنار کے پتے نقش کیے جاتے ہیں اور اس کے ارد گرد کشمیر کی خوبصورت وادیوں کی تصویر کشی کے لیے مختلف پھول بوٹے اور پرندے بنائے جاتے ہیں جو کشمیر کی نمایاں پہچان ہیں۔

"اس فن کا وادی کی دستکاریوں پر بھی اثر رہا جن میں چناروں کے

پتوں بلبلوں اور پھولوں کی بیلوں کے ساتھ آگ اُگلتے اژدہے بھی
نظر آتے جو پیپیئر ماشی کی نقشین دستکاریوں پر مختلف جاذب رنگوں
میں مصور ہوتے اور لکڑی پر بڑی مہارت اور محنت سے منقش کیے
جاتے۔"(۹۴)

کشمیر میں گھروں کی خوبصورتی کے لیے ہاتھ سے بنی چیزوں کے علاوہ بندوقوں کا بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ عموماً وہ بندوقیں جو اب شکار کے لیے استعمال نہیں ہوتی تھیں انھیں دیوار کے ساتھ لٹکا دیا جاتا تھا جو نسل در نسل ثقافتی ورثے کے طور پر چلائی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ حنوط کے ذریعے سے مختلف جانوروں کی اعضا کو محفوظ کر لیا جاتا تھا اور اسے گھروں کی تزئین و آرائش میں استعمال کیا جاتا تھا۔

"چیتے، بھالو، لومڑی، ہرن وغیرہ کو وہیں حنوط کروا کر گھر کے
دیوان خانے، بر آمدے یا بالا دری میں سجایا جاتا۔ صرف سر اور
گردن ہی کو دیواروں پر ٹانکا جاتا اور اگر گولی لگنے سے شکار کی
ظاہری صورت کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا یعنی پورے جسم کی
کھال سلامت ہے تو زندہ و جاوید جیسا حنوط کروانے کے بعد تختوں
پر خشک گھاس اور ٹہنیاں لگوا کر کونے میں ایستادہ رکھا جاتا۔"(۹۵)

کشمیر کی ثقافت کی نمایاں پہچان وہاں کا قالین تھا۔ لیکن پورے ناول میں کہیں بھی ترنم ریاض نے قالین کے بارے میں ذکر نہیں کیا۔ وقت کے ساتھ ثقافتی تنوع نے قالین بافی پر بھی اثرات مرتب کیے، تقسیم کی وجہ سے کشمیری قالین کو اب کشمیری ثقافت میں وہ اہمیت حاصل نہیں ہے جیسے قیام پاکستان سے پہلے تھی۔ اس بات پر افسوس کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

"چاندی کے چھوٹے بڑے اور تانبے کے، عام جسامت سے بڑے

منقش برتن، شاہ توس کے دوشالے، پشمینے کے تھان، کشمیری ریشمی

قالین اور ایرانی غالیچے کہاں غائب ہو گئے۔"(۹۶)

زبان:

زبان خیالات وافکار کے اظہار کا نام ہے۔ زبان کے ذریعے انسان اپنے نظریات وخیالات کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ زبان داخلی اور خارجی دونوں حقیقتوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ زبان ہزاروں سالوں میں ترقی پا کر کسی قوم کی قومی زبان ہونے کا درجہ حاصل کرتی ہے۔ محمد نعیم ورک اپنی کتاب "اردو ناول کا ثقافتی مطالعہ" میں زبان کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "کوئی ثقافت اپنے تصور کائنات سے لے کر روزمرہ کی عملی ضرورتوں تک ہر بات کو زبان کے اندر تعمیر کرتی ہے۔ اس لیے اس ثقافت تک رسائی کا اہم ترین ذریعہ زبان ہے۔"(۹۷) اپنی ہزار سالہ تاریخ میں زبان پر کئی دوسری زبانیں اثر انداز ہوتی ہیں۔ جن سے زبان میں سماجی، تہذیبی، اور معاشی بدلاؤ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ہر نئے انقلاب کے بعد خواہ وہ انقلاب مذہبی ہو، معاشرتی یا سیاسی ہو زبان اس سے متاثر ہوتی ہے۔

"نئی تحریک اور نئے نظام نئے الفاظ لاتے ہیں۔ نئی سیاسی تحریک اور نئے نظام زندگی سے زبان نہیں بدل جاتی۔ نئے الفاظ ضرور آتے ہیں۔ پرانے لفظوں کے معنی بدل جاتے ہیں اور زبان کے قواعد میں بھی تبدیلیاں آجاتی ہیں، لیکن زبان میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں آتا۔"(۹۸)

کشمیری زبان بھی دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح کئی زبانوں سے متاثر ہوئی ہے۔ ان زبانوں میں مقامی زبانوں کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ترنم ریاض نے قیام پاکستان کے بعد اور اکیسویں صدی کے وقت کو ناول میں بیان کیا ہے۔ قیام پاکستان کے وقت انگریز ڈیڑھ صدی سے زیادہ وقت برصغیر میں گزر چکے تھے اور انہیں حکومت سنبھالے ہوئے بھی تقریباً ایک صدی گزر چکی تھی۔ کشمیری زبان میں انگریزی زبان کے کئی الفاظ

مکمل طور پر شامل ہو گئے ہیں۔ ان الفاظ میں "وارننگس"، "بی ہے ویئر"، "اتھاریٹز"، "ڈویلوپ"، "رول موڈل"، "ریسپیکٹ"، "سائی کائٹرسٹ"، "آئی ایم شیور" وغیرہ شامل ہے۔

ترنم ریاض نے اکیسویں صدی کے پہلی دہائی کو بیان کیا ہے جب انگریزی زبان پوری دنیا میں عالمی زبان کے طور پر استعمال کی جارہی تھی۔ عام مشاہدے میں آیا ہے کہ کئی زبانیں ایسی ہیں جن میں موجود دور میں استعمال ہونے والی عالمی زبان انگریزی کے کئی الفاظ داخل ہو چکے ہیں اور اب ان کے معنی بھی وہ ہی سمجھے اور لکھے جاتے ہیں جو اصل میں انگریزی زبان میں موجود ہیں۔ لسانیات کی اصل میں اس عمل کو "کوڈ میسکنگ" کہا جاتا ہے۔

"امریکا اینڈ ڈوپلپینگ کنٹریز کے امیریکاز انفلینس آن سینٹرل ایشیا

والے چیپٹر میں لکھا ہے تاکہ پبلیسیٹی کین فیک دی ری اے لی

ٹیز فار ڈیکیڈس

"Public can fake the realities for decades۔"[۹۹]

ترنم ریاض نے انگریزی زبان کے علاوہ مقامی زبان کے الفاظ کو بھی ناول میں استعمال کیا ہے۔ کشمیری زبان میں ترنم ریاض نے مرکزی کردار "شبیا" کے ذریعے نظم بیان کی ہے۔

"گوڈنچ کُور چھے سونہ روپہ مائژی

دوئم کور چھے توتہ کیسرنھا

تریم کور چھئے تالہ ماکاژی

صاحبو آواز وائژی نو"[۱۰۰]

کشمیری اور انگریزی زبان کے علاوہ ناول میں ہندی زبان کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ ناول کا لینڈ سکیپ "لداخ" کا ہے جو ابھی تک بھارت کے قبضے میں ہے۔ ہندی بھارت کی سرکاری زبان ہے۔ محکوم قوم ہمیشہ اپنے اثرات غلام قوم پر ڈالتی ہے۔ ناول میں "پتی"، "درشن"، "کھاپا"، "نینوں"، "سنجوگ"، "سندر"، "وشواس" وغیرہ کا استعمال نظر آتا ہے۔

"مکھ پر مسکان نظر آنے سے پہلے بھگوان نے ایک چہرہ ایسا بھی

بنایاہے جس کی مسکراہٹ آنکھوں کے گرد عین اسی وقت اُبھر

آتی ہے جب وہ ویکتی مسکرانے کی تیاری کر رہاہو۔۔۔یہ رہسیہ

ایک چہرے کو دیکھ پاتاہے اور ہو سکتاہے بھگوان نے اور بھی

چہرے بنائے ہوں جن کے مسکراہٹ سے اس طرح عجیب

عجیب دلچسپ اور اتنی سندر چیزیں جڑی ہوں۔"(۱۰۱)

کشمیری زبان میں مقامی زبانوں کے اثرات بھی نمایاں دیکھے جاسکتے ہیں۔ جن میں نمایاں زبان پنجابی ہے۔ سکھوں نے مسلمانوں کے دور حکومت میں ہی کشمیر پر حکومت شروع کر دی تھی۔ سکھوں میں زیادہ تر کی زبان پنجابی تھی۔ جس کی وجہ سے ہمیں کشمیری ثقافت میں اور خاص طور پر زبان میں پنجاب کا اثر نظر آتا ہے۔

"تیری مرجی اے ساڈے نالوں وکھ ہون دی

ساڈی مرجی اے تیرے پچھے لکھ ہون دی

دُکھ پچھلا ای جو وی سانو کہنا"(۱۰۲)

رسم ورواج:

رسم ورواج ثقافت کے اہم عناصر میں شامل ہوتے ہیں۔رسم ورواج علاقے کی ثقافت کی عکاسی کے ساتھ ساتھ ایک علاقے کو دوسرے علاقے سے ممتاز بناتے ہیں۔رسم ورواج آہستہ آہستہ ثقافت کا حصہ بنتے ہیں۔کسی بھی رسم کو ثقافت کا حصہ بننے میں کئی سو سالوں کا عرصہ درکار ہوتاہے۔یہ رسم ورواج ایک نسل ؛دوسرے نسل تک منتقل کرتی ہے،یہ سب غیر مادی ثقافت کے مظاہر ہیں۔"غیر مادی ثقافت میں سینہ بہ سینہ روایات،سماجی یا نسلی رسم ورواج،میلہ اور تہوار،مقامی دانش وحکمت،آباؤ اجداد کے ہنر اور دستکاریاں،موسیقی اور مقامی رقص سب شامل ہوتے ہیں۔"(۱۰۳)

وقت کے ساتھ ساتھ ثقافت میں کئی نئی رسمیں شامل ہوتی جاتی ہیں اور پہلے سے موجود رسموں میں سے کچھ وقت کی تبدیلی کے ساتھ ختم ہو جاتی ہیں۔

"فرد کے انفرادی طرزِ عمل کو تشکیل دینے میں رسوم وروایات
جو حصہ لیتی ہیں وہ اس کی مادری زبان کے پورے ذخیرہ الفاظ کے
برابر ہے۔ اور فرد رسوم وروایات پر جو اثر ڈال سکتا ہے وہ مساوی
ہے۔۔۔ فرد کی پوری زندگی ہی اول وآخر اُن سانچوں اور معیاروں
سے ہم آہنگ ہونے کا نام ہے جو اس کی اپنی قوم میں نسل در نسل
منتقل ہوتے ہوئے اس تک پہنچتے ہیں۔"(۱۰۴)

ناول "برف آشنا پرندے" میں ترنم ریاض نے کشمیری رسومات اور ان میں آنے والی تبدیلیوں کے بارے میں تفصیلاً بیان کیا ہے۔ شادی کی رسومات ہر معاشرے میں نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ یہ وہ بنیادی رشتہ ہے جس سے معاشرے کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ شادی کی رسومات ہر معاشرے میں مختلف طرز کی ہوتی ہیں۔ ان میں کئی عناصر اثر پذیر ہوتے ہیں جن میں سب سے پہلا عنصر مذہب ہے۔ کشمیر کی ثقافت پر پہلے بدھ مت، مسلمانوں اور پھر ہندوؤں نے گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس لیے کشمیری ثقافت میں ان تینوں کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ شادی میں ہونے والے بارات کے استقبال یوں کیا جاتا ہے:

"السلام علیکم سانہ مہارازو
چانہ ینہ گاہ پیوعالمس"(۱۰۵)

یہ نغمے بارات کے استقبال میں عورتیں مختلف طرز سے تراشتی ہیں۔ جن میں موقع مناسبت کے تحت تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ بارات کے استقبال کے بعد عورتیں مختلف طرح کے مقامی جھومر پیش کرتی ہیں۔ یہ جھومر ہر علاقے میں مختلف ہوتے ہیں۔ کشمیری عورتیں چار یا آٹھ لوگوں کے گروپ بنا کر اسے پیش کرتی ہیں:

"عورتیں ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے چھ چھ سات سات

کی تعداد میں جنگلا سا بنا کر پاؤں بدل بدل کر لوک گیت گایا کرتیں

۔دو جنگلے بنائے جاتے باری باری گانے کیلئے۔اور کبھی کبھی چار بھی۔"(۱۰۶)

علاقے کی رسومات کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کے لحاظ سے مذہبی رسومات طے کی جاتی ہیں۔ترنم ریاض چونکہ خود مسلمان گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے انھوں نے مسلمانوں کی ازاوجی رشتے میں باندھنے کی مذہبی رسم "نکاح" کا ذکر کیا ہے۔ نکاح اور طعام کے بعد دلہن کی رخصتی کی جاتی ہے۔اس سلسلے میں ایسے نغمے گائے جاتے ہیں جو دل گداز اور پُر سوز ہوں۔

"کلہ ہنز ماجِ چھو دلہیر کو رمُت

کل وژین بالہ اپورو ئے "(۱۰۷)

وادی میں مسلمان خاندانوں میں شہنائی بجانے کا رواج کم ہے۔ کم خاندانوں میں اس طرح کا اہتمام ہوتا ہے۔ دلہن کو دعاؤں میں رخصت کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی آنے والی زندگی میں خوش رہے۔ترنم ریاض پرانے دور میں دلہن کی رخصتی کی بات کرتے ہوئے بتائی ہیں کہ اس دور میں دلہن "ڈولی" کے ذریعے سے اپنے سسرال جاتی تھیں۔چونکہ کشمیر کا علاقہ پہاڑوں پر مشتمل ہے ۔ پہاڑوں پر گھر ہونے کی وجہ سے گاڑی وہاں تک نہیں جاسکتی تھی اور کچے اور دشوار راستوں کی وجہ سے دلہن کو ڈولی پر لایا جاتا تھا۔اس لیے دلہن کو شادی کے پہلے چند دنوں کے لیے بھوکا رکھا جاتا تھا۔

"اور دلہنوں کو ڈولی اٹھنے سے پہلے دو دن تک بھوکا اور پیاسا رکھا جاتا

تھا کہ گاڑیاں ہوتی نہیں تھیں۔برات ناؤ میں آتی یا پیدل۔ڈولی

کہار اٹھاتے تھے۔اور ڈولی کے ساتھ ملحقہ غسل خانہ تو ہو نہیں سکتا

تھا۔دلہن بے چاری نیم مردہ حالت میں سسرال پہنچتی تھی۔"(۱۰۸)

موجودہ دور میں اس رواج میں تبدیلی لائی گئی ہے۔اب بھی کشمیر میں "ڈولی" میں بارات لے جانے کا رواج موجود ہے لیکن اب دلہن کو بھوکا نہیں رکھا جاتا اور نہ ہی ڈولی میں پورا راستہ طے کیا جاتا ہے۔بلکہ دشوار راستوں سے ڈولی کے ذریعے یا مقامی گاڑیوں کے ذریعے دولہن کو لایا جاتا ہے۔

لوک گیت:

ثقافت میں لوک گیت نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ لوک گیتوں علاقے کی عکاسی کرنے کے علاوہ اس کی تاریخ کے بھی عکاسی کرتے ہیں۔ لوک گیت لوگوں کے جذبات وخیالات کو دوسروں تک پہنچنے کا اہم ذریعہ ہوتے ہیں۔ شادی بیاہ کی مختلف رسومات میں ان گیتوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ لوک گیت علاقے کی روایات پر مبنی ہوتے ہیں۔ ہر علاقے کے لوگ کے جذبات میں تنوع پایا جاتا ہے اس لیے ہم دیکھتے ہیں ہر علاقے کے لوک گیت دوسرے علاقے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ہر وہ زبان جس میں لوک ورثہ لکھا یا پڑھا جاتا ہے۔ لوک گیت اس زبان کے ادب کا حصہ ہیں۔ اردو ادب کے بیش بہا خزانے میں مقامی لوک گیت اور لوک روایات کا ایک اہم حصہ موجود ہے۔

"لوک موسیقی سے زیادہ کسی اور موضوع کے متعلق اس قدر غلط
فہمیاں موجود نہیں۔ عوام تو ایک طرف، ماہرین بھی اس حقیقت
سے بے خبر ہیں کہ لوک گیت اور کہانیاں ذہنی تخلیقات کا اعلیٰ
سرمایہ ہیں جو دنیا کی ہر ثقافت کی جان ہیں۔"(۱۰۹)

ترنم ریاض شادی میں گائے جانے والے لوک گیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ ان لوک گیتوں میں موقع محل کے مطابق تبدیلی لائی جاتی ہے۔ خواتین صورت حال کی مطابق نغمے کی سُر، موسیقی اور لے کو طے کرتی ہیں۔ ہر لوک گیت کسی نہ کسی سوچ کو ظاہر کرتا ہے۔

"مکھ موڑ موڑ مسکات جات
اَتی چھبیلی نار چلی کر سنگار
مکھ موڑ موڑ مسکات جات
کاہو اکی اکھیاں رسیلی من بھاوت
آوت ہیں موری سدھ بسر اوت

چلی جات سب سکھیاں ساتھ

مکھ موڑ موڑ مسکات جات (۱۱۰)

ہر گیت کا کوئی نہ کوئی مرکزی خیال ہوتا ہے۔ عموماً لوک گیتوں میں محبت کے جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ لیکن کئی ایسے گیت ہیں جن میں دلہن کی رخصتی کے وقت کے جذبات کو بیان کرنے کے ساتھ اسے دعا دی جاتی ہے کہ وہ ساری زندگی اپنے گھر میں خوشحال وآباد رہے۔

"ہاری وارِیو اندہ لگہ نے

اس کے مطابق اردو کا ترجمہ یوں ہو گا

پی کے گھر تیری عمر کٹے خوشیوں سے دامن بھرا رہے۔" (۱۱۱)

کھانے:

روایتی کھانے ثقافت کی نمایاں پہچان ہوتے ہیں۔ کھانے اس علاقے کے لوگوں کے مزاج کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ثقافت کے دیگر عناصر کے طرح مقامی کھانوں میں بھی تبدیلی آتی ہے۔ اس بات کا قطعی امکان ہے کہ ایک نسل جس مقامی ڈیش کو بہت پسند کرتی ہو، اسے آنے والی نسل میں اتنی مقبولیت حاصل نہ ہو۔ دنیا کے گلوبل ولیج بنے کے بعد مقامی کھانوں پر دوسری ثقافتوں کے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ بعض مقامی کھانوں نے دوسرے کھانوں سے متاثر ہو کر اپنے ذائقے اور طریقہِ بناوٹ میں تبدیلی لائی ہے جبکہ کچھ کھانوں کی جگہ نئے کھانوں نے لے لی ہے۔ ترنم ریاض نے کشمیر کے کھانوں کا ذکر کرتے ہوئے مقامی کھانوں کے ساتھ ساتھ دوسرے کھانوں کا بھی ذکر کیا ہے جو اب کشمیر میں قبولیت عام کا درجہ حاصل کر چکے ہیں اور اب وہ کھانے مقامی ثقافت کا حصہ سمجھے جاتے ہیں۔

باب میں پہلے بھی کشمیری کھانوں پر بعث کی جاچکی ہے کہ کشمیر میں گوشت اور اس سے بنی چیزیں کھانے کی اہم لوازمات میں شامل ہیں۔ " بکرے کی ران کی گول بوٹیوں اور باس متی چاولوں سے خالص گھی، عمدہ مصالحے، خشک میوے، زعفران اور نہ جانے کیا کیا استعمال کر کے۔" (۱۱۲) مقامی کھانوں میں گوشت اور چاول کے علاوہ حلوے کو بہت

پسند کیا جاتا ہے۔ ہر مواقع پر خواہ وہ موقع خوشی کا ہو یا غم کا حلوے کو کھانے کا ایک اہم حصہ سمجھا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ مہمانوں کی خاطر تو ضع کے لیے بھی اس مقامی ڈیش کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس کھانے کو بنانے کے لیے مقامی لوازمات کو بھی استعمال میں لایا جاتا ہے۔

"سینی میں چاندی کے ورق سے ڈھکا کا سوجی کا حلوہ رکھا ہے۔

(اور زعفران والے، زردم نرم نرم حلوے کے اندر بادام، کاجو

، پستہ، چلغوزے، کشمش اور اخروٹ کی گریاں تو ہوتی ہی ہیں)۔"(۱۱۳)

مقامی کھانوں میں "باقر خانیوں" کو نہایت اہمیت حاصل ہے۔ "باقر خانیوں" کو چائے کے ساتھ بطور کھانا استعمال کیا جاتا ہے۔ پنجاب اور دوسرے علاقوں میں باقر خانیوں کو دم لگا کر تیار کیا جاتا ہے جبکہ کشمیر میں اسے تلا جاتا ہے۔ "بید کی ٹوکری میں کلچے، باقر خانیاں، قہوے یا نمکین گلابی چائے سے بھرے تانبے کے، قلعہ کئے گئے بڑے سے منقش سماوار کے ہمراہ چبوترے پر پہنچائی جاتی ہیں۔"(۱۱۴) باقر خانیوں کے مختلف اقسام کشمیر میں پائی جاتی ہیں۔ جن کا ذکر ترنم ریاض نے ناول "برف آشنا پرندے" میں کیا ہے۔ کشمیر میں گاؤں کی خاص لوازمات کو بھی نمکین چائے کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ جن میں گیہوں سے بنی چیزیں اور مکّی کی روٹی شامل ہیں جو ہر انسان کو دعوت طعام دیتی ہیں۔ "نمکین چائے اور مکی کی روٹیوں اور گیہوں کے آٹے سے بنے دو دو پیڑے والے پراٹھوں کے ساتھ تازہ مکھن کی خوشبوئیں دور دور تک پھیل کر کسی ان دیکھی ڈور سے باندھ کر آنافانا میں انہیں گھر کے قریب پہنچا دیتی۔"(۱۱۵) کشمیر کے اندر و باہر اس نمکین چائے کو گلابی چائے یا کشمیری چائے کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کو بنانے کے طریقے میں تبدیلی لائی جارہی ہے اور اسمیں سوڈا ملا کر پیا جاتا ہے۔

"جب تک بچے بے ضرر، سیاہ پتی والی سوڈا ملا کر پکائی گئی بیگنی رنگ

کی دودھ ملانے کے بعد گلابی ہوئی لذیذ چائے کے ساتھ کلچے باقر

خوانیاں نوش کر چکے ہوتے کہ وادی میں خوراک کا ایک اہم جز

صبح اور شام کو نمکین چائے والا ناشتہ ہوتا۔"(۱۱۶)

سوڈا ملا کر چائے لکھنو میں پی جاتی تھی لیکن وقت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ کشمیر میں بھی اب ایسی چائے پسند کی جاتی ہے جو آہستہ آہستہ ثقافت کا حصہ بنتی جارہی ہے۔ اب کشمیر میں زیادہ تر سوڈا والی چائے کو ہی پسند کیا جاتا ہے۔ کشمیر کی سیاہ پتی والی چائے صحت کے لیے نسبتاً زیادہ اچھی تھی۔

کشمیر کے کھانوں میں اہم کھانا "شب دیگ" ہے جسے کشمیر کا ثقافتی کھانا ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ جس میں شلجم اور دیگر مصالحہ جات کے ساتھ ملا کر بنایا جاتا ہے۔ اب کھانے کی اس قسم کو پورے برصغیر میں بنایا جاتا ہے۔

لباس:

لباس ثقافت میں بڑا اہم عنصر سمجھا جاتا ہے۔ ہر علاقے کے ملبوسات میں فرق پایا جاتا ہے۔ لباس کا تعین معاشرے کے نصب العین کرتے ہیں۔ مغرب میں جن ملبوسات کو ثقافتی ملبوس کا درج حاصل ہے، وہ مشرق کے ثقافتی نصب العین سے مختلف ہیں۔ لباس معاشرتی اقدار کی پاس داری کرتا ہے۔ اسی لیے لباس کے انتخاب میں معاشرتی اقدار اور رہن سہن کے طریقوں کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ لباس کے انتخاب میں معاشرے کی اقدار اور مذہب برابر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وقت کے بدلنے کے ساتھ جیسے نصب العین میں تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے ویسے ہی ملبوسات کے انتخاب میں بھی تنوع پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ کشمیر کی اپنی ثقافت ہے جو اسے دنیا کی ثقافتوں سے ممتاز اور منفرد بناتی ہے۔ "شملا" کشمیری ثقافت میں نہایت اہمیت میں حامل تھا۔ کشمیر میں مرد اس کا استعمال لباس کے ساتھ ہر موقع پر کرتے ہیں۔ وقت کی تبدیلی کے ساتھ جب کشمیری عوام نے کوٹ پتلون کا استعمال شروع کیا، تو کوٹ پتلون کے ساتھ شملے پہنے لگے۔ جو اب کشمیری ثقافت میں ثقافتی لباس کی نمائندگی کرتا ہے۔

> "اباجی نے گہرے نیلے رنگ کا کوٹ پتلون پہن رکھا تھا جو تصویر
> میں سیاہ نظر آتا تھا۔ ان کا شملے والا سفید طرّہ البتہ سفید ہی نظر آتا
> تھا۔ نیلی نک ٹائی بھی سیاہ معلوم ہوتی تھی۔"(۱۱۷)

کشمیر میں عورتیں "پھیرن" کا استعمال کرتی ہیں۔ "پھیرن" کو مقامی لباس میں نہایت اہمیت حاصل ہے۔ عورتیں آج بھی مقامی لباس میں "پھیرن" کو زیادہ اہمیت دیتی ہیں۔ خاص طور پر شادی بیاہ کے موقعے میں "پھیرن" کو ثقافت کی رونمائی کے طور پر لازمی پہنا جاتا ہے۔

"رنگ رنگی کانگڑیوں کو گلے میں لٹکائے کانگڑی والے کا چہرہ
پھولوں میں چھپا معلوم ہوتا ہے۔ اور جب اس نے انہیں
گلے سے نکال کر زمین پر رکھا تو شیبا نے دیکھا کہ اس نے پھرن
نہیں پہنا تھا۔ وہ ہر اصل و نسل کشمیری کی طرح حسین تھا اور
اس نے جیکٹ پہن رکھی تھی۔"(۱۱۸)

کشمیری لباس "پھیرن" عورتوں کا ثقافتی لباس ہے۔ "پھیرن" کے علاوہ کشمیری عورتیں ہاتھ سے کڑھائی کیے گئے ملبوسات کا استعمال کرتی ہیں۔ ان لباسوں میں زیادہ تر ریشمی لباس ہوتے ہیں۔ انگریزوں کے دور سے ہی کشمیر میں ریشمی کپڑے بنانے کے کارخانے قائم کر دیے گئے تھے۔ آج بھی کشمیر کا ریشمی کپڑا پوری دنیا میں مشہور ہے۔ مقامی عورتیں ریشمی کپڑے سے شلوار قمیض بنواتی تھی۔ "باجی نے گہرے گلابی رنگ کے کشمیری ریشم کا شلوار قمیض پہن رکھا تھا۔۔۔ گہرے گلابی رنگ کا سوٹ جا بجا فیروزی رنگ کے ریشمی دھاگوں سے کاڑھا گیا تھا۔"(۱۱۹) کپڑوں پر دھاگوں سے کڑھائی کے علاوہ ستارے موتی اور مقیش کا استعمال کیا جاتا ہے جس سے مختلف طرز کے پھولوں کے ڈیزائن بنائے جاتے ہیں۔

"سیاہ ریشم کی قمیض کے دامن پر کڑھی پتلی سی بیل سے میچ کرتا
ہوا امی ایک پرانا مگر بڑا ہی حسین دوپٹہ اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔
جس نے اس کے لباس کے حسن دوبالا کر دیا تھا۔۔۔ شبیا نے اپنے
پائینچوں کی طرف دیکھا کہ پائینچوں پر بھی قمیض کے دامن والی
نیلی ہری بیل کڑھی تھی اور امی کے دوپٹے میں انھیں رنگوں کی

دھاریاں تھیں۔"[۱۲۰]

کشمیری لباس میں تنوع سے مردوں کے لباس بھی متاثر ہوا ہے۔ پہلے مرد "چغہ" استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اب "چغے" کے ساتھ پتلون اور قمیض کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔

"اس نے بہت سی جیبوں والی کسی نرم کپڑے کی سیاہ قمیض پہن
رکھی ہے۔ اور پتلون خاکی رنگ کی ہے۔ اس نے گلے کے
اطراف خاکی اور سیاہ خانوں والا ایسے ہی کسی نرم سے روئیں والے
کپڑے کا گلوبند ڈال رکھا تھا۔"[۱۲۱]

لباس میں تنوع کی بڑی وجہ مختلف قوموں کا کشمیر میں حملہ آور ہونا ہے۔ وقت کے ساتھ کشمیر کے لوگوں نے حملہ آور قوموں کی ثقافت کے اثرات قبول کیے اور اسے اپنی ثقافت کا حصہ بنایا۔

ج۔ اعتقادی اعتبار سے ثقافتی مظاہر کا مطالعہ

مذہب:

مذہب سے مراد وہ قانونین ہیں جو انسان کو زندگی گزرنے کے متعلق صحیح رہنمائی کرتے ہیں۔ ہر علاقے میں مذہب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کلچر میں مذہب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ معاشرہ اپنی حدود کا تعین مذہب کے اندر رہ کر کرتا ہے۔ تمام علوم اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ انسان کے دل و دماغ میں مذہب کو حکمرانی حاصل ہے۔ مذہب ہی معاشرتی حدود طے کرتا ہے۔ ہر مذہب کے خاص مقاصد اور معنی ہوتے ہیں۔ وقت کی تبدیلی کے ساتھ مقاصد میں تبدیلی نہیں آتی لیکن معنی وقت کے تقاضوں کے لحاظ سے خود میں ترمیم لاتے رہتے ہیں۔

"مذہبی اصول و عقائد کی ہماری زندگی میں بنیادی اہمیت ہے۔
جب کوئی معاشرہ ان عقائد و اصول، اس نظام فکر و عمل کو حیات
کا زندہ قانون بنا کر اپنی زندگی کو اس کے مطابق متشکل کرتا ہے

اور اپنے احساس کو اس کے سانچے میں ڈھالتا ہے تو اس عمل سے

وہ ایک ممتاز کلچر کو جنم دیتا ہے۔ جسے ہم اس نظام حیات کا کلچر

کہہ سکتے ہیں۔"(۱۲۲)

ترنم ریاض نے کشمیر کی تاریخ کے دوران ان مذاہب کا ذکر بھی کیا ہے جو کشمیر ثقافت پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ کشمیر کی تاریخ کا آغاز بدھ مت سے ہوا تھا۔ بدھ مت نے کشمیر سے اپنا مذہب پھیلانا شروع کیا۔

"بودھ مت کے ایک مخصوص فرقے کے پیروکار اس راجہ کو،

بودھ کی تعلیمات کے مختلف انداز سے اپنائے گئے معنی کے سبب

پیدا ہوئے کنفوزن کو دور کر کے ایک نیا تری پٹکا ترتیب دینے کی

خاطر کانفرس منعقد کرنا مقصود تھی۔ اب بھی تابنے کی تختیوں پر

کندہ وہ سربم ہر گنجینہ اسی سرزمین میں دفن ہے۔ یا عشروں سے

بودھ عابدوں اور دانشوروں کے سینوں میں کسی مخصوص وقت

تک منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ غالباً یسوع مسیح کے نسل در نسل منتقل

ہو رہے۔"(۱۲۳)

بدھ مت کے بعد مختلف ادوار میں مختلف مذاہب چلتے آتے رہے ہیں۔ کبھی ہندو مت کے ماننے والے غالب رہے، کبھی ناگ دیوتا کو ماننے والے۔ الغرض مختلف ذرائع سے لوگ اپنی روحانی تسکین کا ذریعہ ڈھونڈتے رہے ہیں۔ بدھ مت کے بعد ہندو مذہب نے کشمیر کی ثقافت پر اثرات ڈالے ہیں۔ یہ قبائل سکندر اعظم کے ساتھ کشمیر آئے۔ ہندو مت کے نزدیک ہمالیہ کی پہاڑیاں آج بھی بہت مقدس سمجھی جاتی ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر کے نام ہندو مت سے ہی لیے گئے ہیں۔

"سکندر اعظم کے ہمراہ وارد ہوئے کچھ یہودی قبائل کے ساتھ

وادی پہنچا۔ کشمیر کے پہاڑوں پر رہنے والے اب بھی اسرائیل
نام شوق سے رکھتے ہیں اور کشمیر کے کئی مقامات کے نام یہودی
ناموں سے ملتے ہیں۔ کشمیری پنڈت فرقے ہندومت میں بھگو
ان کو کئی دیوی دیوتاؤں میں بانٹ دیا گیا ہے اور ان کے خیال میں
یہ اچھا ہی ہوا ہے کے لوگ ان سے نسبتاً بہت حد تک مماثلت
رکھتے ہیں۔"(۱۲۴)

ہندومت کے بعد ناگ پوجا کا مذہب کشمیر میں شروع ہوا۔ کشمیر کا دیومالائی پہاڑ منی کشیپ سے اس مذہب کا آغاز ہوا۔ اس مذہب کو شروع کرنے والای کشیپ رشی تھا۔ کشیپ رشی نے وشنو بھگوان پر حملہ کر کے باقی دیوتاؤں کا کام تمام کیا۔ "پھر کشیپ منی کی اس وادی میں ناگوں اور دیوی دیوتاؤں نے زمینی خطوں اور جھیلوں کی شکل اختیار کر لی"(۱۲۵) کشمیر میں کافی عرصے تک ناگ کو پوجا جاتا رہا ہے۔

کشمیر میں مذہب اسلام کا آغاز گیارھویں صدی عیسوی میں ہوا ہے۔ اس سے پہلے کشمیر میں مختلف مذہب موجود تھے گیارھویں صدی میں حضرت شاہ ہمدانؒ کے آنے کے بعد اسلام کشمیر میں پھیلا۔ وہ خاندان جنہوں نے اسلام قبول کیا انہیں نو مسلم شیخ کہا جاتا تھا۔

"شیخ خاندان وہ کہلائے تھے جو گیارھویں صدی میں حضرت
شاہ ہمدان کے ہندوستان آنے پر مشرف بہ اسلام ہوئے جن
کے ہمراہ کئی سیدزادے بھی تھے اور ان کی درگاہیں وادی کے
مختلف علاقوں کے علاوہ سری نگر میں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔"(۱۲۶)

مسلمانوں کی کشمیر میں آمد کے ساتھ ہی صوفیاء اکرام نے بھی کشمیر کا رخ کیا۔ ترنم ریاض نے دو صوفیا اکرام کا ذکر اپنے ناول "برف آشنا پرندے" میں کیا ہے۔ یہ صوفیاء اکرام نہ صرف لوگوں کو مذہب اسلام کی طرف بلاتے تھے

بلکہ اس کے ساتھ اپنے کرامات سے بھی لوگوں کو متاثر کرتے تھے۔ غوث پاکؒ سے روایت منسوب ہے کہ وہ قرآن کی کچھ آیات شکم مادر سے ہی یاد کر کے آئے تھے۔

"غوث پاکؒ حضرت میران صاحب سے روایت منسوب ہے کہ
شکم مادر میں تلاوت کلام پاک سننے سے انہیں آیات ازبر تھیں اور
سائنس نے یہ ثابت کر دیا کہ ماں نفسیات وحالات، ماحول، آوازیں،
صحت و تندرستی، مزاج اور آرام بلکہ ہر شے پیدا ہونے والے بچے
کی جسمانی اور ذہنی صحت پر اثرانداز ہوتی ہیں۔"(۱۲۷)

کشمیر کے صوفی بزرگ "حضرت شیخ نورالدین نورانی" جو ایک عالم دین تھے، ان کے کلام کو شُرک کہا جاتا ہے۔ شرک سنسکرت کے لفظ "شلوک" ہے جو کشمیری زبان میں آکر شُرک ہو گیا تھا۔ انہوں نے کشمیر میں مذہب کو پھیلانے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔

"پران ان خاءلی پر گیتہ
خر گیتہ کتاب باءری ہیتھ
ہیم دلہ نشہ باخبر گئیہ
تم نر گئے تار تیئر تھ گیتھ (۱۲۸)

کشمیر کی ثقافت میں جن مذہب کے اثرات مرتب ہوئے ہیں ان کو ایک ساتھ ترنم ریاض نے یوں بیان کیا ہے:

"قدیم ترین زبان وتہذیب کا مرکز کشمیر۔ رشیوں منیوں کا کشمیر،
شیخ العالم اور لل دید کا کشمیر، شا کھیہ منی کی پیشن گوئی کا بودھ گہوارہ
کشمیر، کشیپ رشی اور پرورسین کا کشمیر، للتا دیتہ کا اور سوئیہ کا کشمیر،
اشوک، کنشک، کلہن اور بڈھا شاہ کا کشمیر، حبہ خاتون کا کشمیر، ارنی

مال کا کشمیر۔"(۱۲۹)

توہمات:

توہم پرستی معاشرے کے ان عقائد کا نام ہے جو نہ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اور نہ معاشرے کا ان عقائد سے کوئی لین دین ہوتا ہے۔ اس سب کے باوجود یہ عقائد نسل در نسل چلتے آتے ہیں۔ انسان بچپن سے ہی کسی نہ کسی چیز سے خوف زدہ رہتا ہے۔ اسی خوف پر وہ اپنا عقائد قائم کر لیتا ہے کہ یہ چیز اس کے لیے نقصان دہ ہے۔ بعض قدرتی آفات بھی کچھ توہمات کو جنم دیتی ہیں۔ برصغیر کے علاقے میں مذہب کے نام پر ایسے ایسے عقائد بنائے گئے ہیں، جن کا اصل مذہب سے کوئی تعلق ہی نہیں پایا جاتا۔ کشمیر کے راجہ "راجہ گلاب" کے بارے میں ایک توہم پرستی پائی جاتی ہے کہ راجہ کی وفات کے بعد ان کی روح مچھلی میں چلی گئی تھی۔

"پہلے ڈوگرہ راجہ گلاب سنگھ کے انتقال پر پروہتوں نے بتایا کہ ان
کی روح مچھلی میں داخل ہوئی ہے۔ ان کی روح کی بے حرمتی نہ ہو
اس لئے ان کے جانشین مہاراجہ نے چھ برس تک مچھلی کے شکار پر
پابندی عائد کر دی۔"(۱۳۰)

یہاں تک یہ مچھلی کے شکار پر اس وقت پابندی عائد رہی جب تک علاقے میں غذا کی کمی نہ ہو گئی۔ قحط کے دنوں میں بھوک سے تنگ آکر مچھلی کے شکار کی اجازت دی گئی لیکن فوراً ہی حکم واپس لے لیا گیا کہ اس بات سے راجہ کے روح کو تکلیف ہو گئی۔

توہمات کی حیثیت مقامی ہوتی ہے۔ ہر علاقے میں توہمات مختلف ہوتی ہے۔ یہاں تک کے ایک ہی توہم کا دوسرے علاقے میں مطلب مختلف ہو جاتا ہے۔ یہ علامتیں استعارے کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔

"ممکن ہے یہ چیزیں کسی مثبت اشارے کی حامل ہوا کرتی ہوں۔
شبیا نے مثال دی تھی کہ جیسے ہمارے یہاں اُلوّ اور گدھا، اُلو اور

گدھا ہی ہوتا ہے جبکہ بعض مقامات پر ان دونوں کو عقل مند

گردانا جاتا ہے۔"(۱۳۱)

اساطیر:

اساطیر انگریزی زبان کے لفظ "میتھ" سے نکلا ہے۔ "اسطورہ" کی تعریف مختلف لغات میں مختلف انداز میں کی گئی ہے۔ اساطیر سے مراد وہ قصے کہانیاں ہیں جو روحانی حیثیت رکھتے ہیں۔ اساطیر میں وہ قصے کہانیاں شامل ہوتے ہیں جن کو لوگ مذہب سے وابستہ کرتے ہیں۔ ان قصوں میں مافوق الفطرت عناصر، جن، بھوت،، مذہبی خرافات شامل ہیں۔ اس میں ایسی کہانی بنائی جاتی ہے جس کا تعلق کسی نہ کسی مذہبی یا روحانی شخصیت سے ہوتا ہے۔ تاکہ علاقے کے لوگوں پر اس شخصیت کے واضح اثرات مرتب ہوتے دیکھے جاسکتے۔ انوار جمال لکھتے ہیں:

"قدیم افسانوی قصوں اور دیوی دیوتاؤں سے متعلق اثار کو اساطیر،
دیومالا یا علم الاصنام کہتے ہیں۔ اس ضمن میں یونانی، مصری اور ہندی
دیومالا کو بہت اہمیت حاصل ہے۔"(۱۳۲)

ترنم ریاض کشمیر میں پائے جانے اساطیر کے بارے میں ذکر اپنے ناول میں کرتی ہیں۔ کشمیر میں "ناگ رائے" کی کہانی بطور اساطیر استعمال کی جاتی ہے۔ اس اساطیر کے مطابق جو سانپ سو سال کا ہو جائے تو قدرت کی طرف سے اسے ایک خاص صلاحیت سے نوازا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ انسان کا روپ اختیار کر سکتا ہے۔ کشمیر کے لوگوں کے مطابق یہ ناگ رائے "تاپال" میں رہتا ہے۔" اور وہ بھی جھیل کے نیچے کہیں بہت اندر۔ اس نے پانی سے باہر نکلتے ہی بھیس بدلا اور ایک حسین نوجوان کی شکل اختیار کر لی۔"(۱۳۳) اس کہانی میں شہزادی کا کردار "ہیمال" نامی ایک لڑکی کا ہے جو وہاں کے بادشاہ کی بیٹی ہے۔ بادشاہ ناگ رائے کو پسند نہیں کرتا تھا۔ ابھی تک ناگ رائے راجہ بھی نہیں بنا تھا۔

"وہ گہرے پانیوں کے راستے باہر نکل کر اس دنیا میں آجاتا ہے۔
ادھر بادشاہ اپنی شہزادی کے لئے کسی اچھے دولہے کی تلاش میں
تھا کہ شاہزادی کسی سے شادی کرنے پر راضی نہیں ہوتی تھی۔

جب شہزادی ناگ رائے سے مل کر خوش نظر آئی تو بادشاہ ناگ

رائے کی رہائش کا انتظام شاہی محل کے خاص مہمان خانے میں

کرواتا ہے۔ یہ ناگ رائے اور شہزادی کی دوستی ہو جاتی ہے۔"(۱۳۴)

کشمیر میں جب سے ناگ کی پوجا کا مذہب شروع ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی مذہبی اساطیر بھی بنانا شروع ہو گئی تھی۔ ناگ پوجا کے مذہب کے بانی "کشیپ رشی" تھے جنہوں نے باقی دیوتاؤں سے جنگ کر کے ان کا خاتمہ کیا۔ اس کے بعد کئی جھلیں کشمیر میں وجود میں آئی جن میں سے ایک "ولر" تھی۔ اس جنگ کے دوران وہ خشک ہو گئی تھی۔

"جب ولر کا نام مہاپدم جھیل رکھا گیا تھا اور ڈل کو ہستو الیکا کا

پکارا جاتا تھا مگر ڈل جھیل کئی ہا برس تک ریگستان تھی اور اس

کا نام تالن مرگ تھا۔ بعد کو جھیل بننے پر بہت دیر تک تالاب

مرگ کہلاتی رہی تھی یہ جھیل۔ اور عزیز از جان اس کے شہر

سرینگر کا قدیم پرور پورہ تھا یعنی راجہ رپور سین کا بسایا ہوا نگر۔"(۱۳۵)

اساطیر ہر علاقے کی ثقافت کا حصہ رہی ہیں۔ تاہم بدلتے حالات اور جدید ٹیکنالوجی نے کسی حد تک اساطیر کو کم دیا ہے۔ لیکن اب تک اساطیر کے اثرات ثقافت میں موجود ہیں اور لوگ اسے مانتے ہیں اور اس کے مطابق لوگ اپنی زندگی بھی گزرتے ہیں۔

حوالہ جات

۱. عزیز احمد (مکتوب)، بنام چوہدری ریاض احمد، مطبوعہ: سویرا، سویرا پریس، لاہور، شمارہ:٦٧،
س۔ن، ص:۲۵۳

۲. اعجاز حنیف، ڈاکٹر، عزیز احمد: شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص:۸۲

۳. طاہرہ سرور، ڈاکٹر، "عزیز احمد کے ناول " آگ "کا تجزیاتی مطالعہ "(مضمون)، خیابان بہار، شمارہ:۳۸، ۲۰۱۸،
جامعہ پشاور، ص:۲

۴. یوسف سرمت، بیسوی صدی میں اردو ناول، نیشنل بک ڈپو، حیدر آباد، دسمبر، ۱۹۷۳ء، ص:۳٦۲

۵. وزیر آغا، معنی اور تناظر، انٹر نیشنل اردو پبلیکیشنز، دہلی، ۲۰۰۰ء، ص:۴۳

6. The culture of Kashmir,S.M.Iqbal,K.LNirash,Marwah publications,new Delhi,1978,pg:1

۷. طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱٦ء، ص:۴۰۱

۸. ایضاً، ص:۴۷۵

۹. ایضاً، ص:۵۴۳

۱۰. ایضاً، ص:۴۰۱

۱۱. چراغ حسن حسرت، کشمیر، کارگر پبلی کیشنز، دہلی، ۱۹٦۳ء، ص:۱٦

۱۲. محمد اسلم فاروقی، ڈاکٹر، عزیز احمد کی ناول نگاری کا تنقیدی مطالعہ، روشناس پرنٹرس، دہلی، ۲۰۱۵ء، ص:۸۱

۱۳. مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، ثقافتی بشریات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء، ص:۹۷

۱۴. فیض احمد فیض، ہماری قومی زبان، ادارہ یادگار غالب، کراچی، ۱۹۷٦ء، ص:۲۳

۱۵. طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، ص:۳۹۴

۱٦. ایضاً، ص:۳۹۴

۱۷. ایضاً، ص:۴۵۳

۱۸. ایضاً، ص:۳۹۷

۱۹. ایضاً، ص:۴۷۵

۲۰. ایضاً، ص:۴۷۷

۲۱. ایضاً، ص:۵۶۶

۲۲. اعجاز حنیف، ڈاکٹر، عزیز احمد: شخصیت اور فن، ص:۸۱

۲۳. طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، ص:۵۹۴

۲۴. ایضاً، ص:۶۰۴

۲۵. قدرت اللہ فاطمی، "ثقافت کے جغرافیائی عوامل"، رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ثقافت، اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۹ء، ص:۷۹

۲۶. چراغ حسن حسرت، کشمیر، ایضاً، ص:۸

۲۷. طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، ص:۵۵۵

۲۸. ایضاً، ص:۴۹۶

۲۹. وزیر آغا، کلچر کے خدوخال، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص:۹۴

۳۰. طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، ص:۴۰۵

۳۱. ایضاً، ص:۵۰۰

۳۲. ایضاً، ص:۴۰۷

۳۳. ایضاً، ص:۴۰۶

۳۴. مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، ثقافتی بشریات، ص:۲۴۶

۳۵. جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، مشتاق بک ڈپو، کراچی، ۱۹۶۴ء، ص:۲۱۳

۳۶. طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، ص:۴۱۱

۳۷. ایضاً، ص:۴۹۷

38. https://www.humsub.com.pk,17November2024,6:50pm

۳۹. طاہر منصور فاروقی، مرتب:عزیز احمد کے چار ناول، ص:۴۴۵

۴۰. ایضاً، ص:۴۸۱

۴۱. روتھ بنیڈکٹ، ڈاکٹر، نقوش ثقافت، مترجم:سید قاسم محمود، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص:٦

۴۲. طاہر منصور فاروقی، مرتب:عزیز احمد کے چار ناول، ص:۴۳۹

۴۳. ایضاً، ص:۴٦۰

۴۴. ایضاً، ص:۴٦۱

۴۵. ایضاً، ص:۴۳۳

۴٦. ایضاً، ص:۴۳۵

۴۷. ایضاً، ص:۴۱٦

۴۸. ایضاً، ص:۴۳۰

۴۹. ایضاً، ص:۴٦۱

۵۰. ایضاً، ص:۴۲۴

۵۱. ایضاً، ص:۴۰۴

۵۲. ایضاً، ص:۴۱۷

۵۳. ایضاً، ص:۴۰۳

۵۴. ایضاً، ص:۴۱۰

۵۵. ایضاً، ص:۴۲۰

۵٦. مظفر حسن ملک، ثقافتی بشریات، ص:۲۳۵

۵۷. ایضاً، ص:۴۹

۵۸. طاہر منصور فاروقی، عزیز احمد کے چار ناول، ص:۳۹۷

۵۹. ایضاً، ص:۵۵۵

۶۰. ایضاً، ص:۵۵۸

۶۱. ایضاً، ص:۴۲۳

۶۲. ایضاً، ص:۴۸۳

۶۳. وزیر آغا، تخلیقی عمل، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، ۱۹۷۰ء، ص:۵۱

۶۴. طاہر منصور فاروقی، عزیز احمد کے چار ناول، ص:۴۹۷

۶۵. انتخاب حمید، اردو کے نئے ناول صنفی و جمالیاتی منطق، کتابی دنیا، لاہور، ۲۰۲۳ء، ص:۱۹۸

۶۶. ایضاً، ص:۲۰۶

67. https://www.urdulink.com.pk,15December2024,8:43pm

۶۸. مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، ثقافتی بشریات، ص:۲۵۷

۶۹. محمد الدین فوق، شاہی سیر کشمیر، اراکین مجلس ادبیات عالیہ، کشمیر، اکتوبر، ۲۰۲۰ء، ص:۱۶

۷۰. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، بک کارپوریشن، دھلی، ۲۰۰۹ء، ص:۲۹۴

۷۱. ایضاً، ص:۲۴۳

۷۲. ایضاً، ص:۱۳۸

۷۳. ایضاً، ص:۵۲۳

۷۴. انتخاب حمید، اردو کے نئے ناول صنفی و جمالیاتی منطق، ص:۲۰۱

۷۵. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۲۶۶

۷۶. مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، ثقافتی بشریات، ص:۲۴

۷۷. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۲۲

۷۸. ایضاً، ص:۱۳۲،۱۳۱

۷۹. ایضاً، ص:۴۲۰

۸۰. ایضاً، ص:۵۲۲

۸۱. ایضاً، ص:۲۶۰،۲۵۹

۸۲. ایضاً، ص:۲۶۴

۸۳. ایضاً، ص:۲۷۲

۸۴. ایضاً، ص:۲۵۷

۸۵. انتخاب حمید، اردو کے نئے ناول صنفی و جمالیاتی منطق، ص:۲۰۴

۸۶. نظیر صدیقی، "ثقافت اور اس کے عوامل۔۔۔بیرونی اثرات"، مشمولہ: کلچر: منتخب تنقیدی مضامین، مرتب: اشتیاق احمد، بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۲۳ء، ص:۲۹۵

۸۷. وزیر آغا، کلچر کے خدوخال، ص:۹۴

۸۸. بیرن چارلز ہیوگل، سیاحت نامہ کشمیر و پنجاب، مترجم: محمد حسن صدیقی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۰، ص:۴۸۷

۸۹. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۱۳۲

۹۰. ایضاً، ص:۲۱۵

۹۱. جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، ص:۵۷، ۴۷

۹۲. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۳۷

۹۳. ایضاً، ص:۲۴

۹۴. ایضاً، ص:۳۷

۹۵. ایضاً، ص:۳۴

۹۶. ایضاً، ص:۲۴

۹۷. محمد نعیم ورک، اردو ناول کا ثقافتی مطالعہ، کتاب محل، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص:۱۲

۹۸. شکیل الرحمن، زبان اور کلچر، بروکار پریس سرینگر، کشمیر، ۱۹۸۵ء، ص:۱۵

۹۹. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۱۸۱

۱۰۰. ایضاً، ص:۱۷۳

۱۰۱. ایضاً، ص:۴۱۵

۱۰۲. ایضاً، ص:۴۷۸

۱۰۳. عکسی مفتی، پاکستانی ثقافت، الفیصل ناشر، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص:۵۰

۱۰۴. مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، ثقافتی بشریات، ص:٦

۱۰۵. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۲۱۰

۱۰٦. ایضاً، ص:۲۱۰

۱۰۷. ایضاً، ص:۲۱۰

۱۰۸. ایضاً، ص:۵۸

۱۰۹. مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، ثقافتی بشریات، ص:۳٦۳، ۳٦۲

۱۱۰. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۴۷٦

۱۱۱. ایضاً، ص:۲۱۱

۱۱۲. ایضاً، ص:۴٦۲

۱۱۳. ایضاً، ص:۲٦

۱۱۴. ایضاً، ص:۵۳

۱۱۵. ایضاً، ص:۱۴۲

۱۱٦. ایضاً، ص:۲٦۰

۱۱۷. ایضاً، ص:۲۰

۱۱۸. ایضاً، ص:۴۹۳

۱۱۹. ایضاً، ص:۹۷، ۹٦

۱۲۰. ایضاً، ص:۵۰۳

۱۲۱. ایضاً، ص:۴۳۷

۱۲۲. جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، ص:۱۵۱

۱۲۳. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۲۳

۱۲۴. ایضاً، ص:۱۳۲،۱۳۱

۱۲۵. ایضاً، ص:۲۹۳

۱۲۶. ایضاً، ص:۶۱

۱۲۷. ایضاً، ص:۲۳۶

۱۲۸. ایضاً، ص:۲۹۱

۱۲۹. ایضاً، ص؛۶۲

۱۳۰. ایضاً، ص:۲۶۲

۱۳۱. ایضاً، ص:۴۱۹

۱۳۲. انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص:۳۶

۱۳۳. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۱۹۶

۱۳۴. ایضاً، ص:۱۹۹،۱۹۸

۱۳۵. ایضاً، ص:۲۹۴،۲۹۳

باب سوم

منتخب ناولوں میں کشمیری ثقافت کے تنوع کا جائزہ

ثقافت عربی زبان کا لفظ ہے۔ ثقافت انسانی زندگی پر محیط ہوتی ہے۔ کوئی بھی انسان جو معاشرے سے تعلق رکھتا ہے وہ ثقافت کے تحت زندگی بسر کرتا ہے۔ ثقافت میں انسانی زندگی کا ہر لمحہ شامل ہوتا ہے۔ ثقافت وقت کے ساتھ ساتھ ارتقاء کرتی ہے۔ ثقافت کے عناصر میں تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے لیکن تنوع کے عمل میں بھی ثقافت اپنا وجود قائم رکھتی ہے کسی بھی عنصر کو یک دم ثقافت میں داخل یا باہر نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس عمل میں صدیوں کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔

"اس کا تعلق اپنے ماحول اور علاقے کے جغرافیائی حالات، رسوم، روایات، مظاہر، اقدار اور عقائد سب سے ہوتا ہے۔ یہی روح ہر معاشرے کی لائف لائن ہوتی ہے۔ لہٰذا، اس کی خارجی پرتوں میں وقت کے ساتھ رونما ہونے والے انقلابات اور تبدیلیوں کے باوجود، ہر زمانے میں اس کا تسلسل باقی رہتا ہے۔"(۱)

ثقافت میں تبدیلی ایک فطری عمل ہے۔ ثقافتی تنوع کا عمل کچھ فطرت کے زیر اثر تبدیل ہوتا ہے اور کچھ عناصر کی تبدیلی کی وجوہات مادی اشیاء ہوتی ہیں۔ مثلاً موسمی تبدیلیوں کی وجہ سے ثقافت میں تبدیلی فطرتی عمل ہے جبکہ سڑکوں، عمارتوں، رہن سہن کے طریقوں میں تبدیلی مادی وجوہات ہیں۔ ثقافت میں تبدیلی بآسانی نہیں لائی جاسکتی کیونکہ ثقافت انسان کی پیدائش سے اس پر اثر انداز ہونا شروع ہو جاتی ہے، بچہ بچپن سے جو باتیں سنتا اور دیکھتا ہے اسے ہی اپناتا ہے۔ ان اطوار میں مکمل طور پر تبدیلی لانا ممکن نہیں البتہ دیرپا کوشش کی وجہ سے کافی حد تک اس میں ترمیم کی جاسکتی ہے۔ ثقافت میں تنوع کی رفتار ہر معاشرے میں مختلف ہوتی ہے۔ ڈاکٹر مظفر حسن ملک اپنی کتاب "ثقافتی بشریات" میں ثقافتی تنوع کی رفتار پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہر زندہ ثقافت میں تغیر و تبدیل اور ارتقاء کا عمل مسلسل جاری
رہتا ہے۔ جہاں تک قدیم اور ابتدائی نوعیت کی ثقافتوں کا تعلق
ہے ان میں یہ عمل آہستہ آہستہ رُونما ہوتا ہے مگر جدید ترقی یافتہ
ثقافتوں میں تبدیلیوں بڑی سرعت سے رونما ہوتی ہیں۔"(۲)

ثقافت میں تنوع کا بڑی حد تک انحصار ثقافت کے زندہ یا مردہ ہونے پر ہوتا ہے۔ کوئی ثقافت جو جمود کا شکار ہو چکی ہو، اس میں تنوع لانا ناممکن عمل ہے۔ وہی ثقافت تنوع کے اثرات کو قبول کر سکتی ہے جو زندہ ہو کیونکہ مردہ ثقافتیں تاریخ کا حصہ بن چکی ہوتی ہیں مثلاً مصری یا قدیم یونانی ثقافتوں میں تبدیلی لانا ناممکن عمل ہے۔ ثقافت میں تبدیلی کی وجوہات میں مقامی اثرات کے ساتھ دیگر اقوام اور ملکوں کے اثرات بھی شامل ہیں۔ جدید دور میں ٹیکنالوجی کی وجہ سے ہر ملک دوسرے ملک سے درآمدت اور برآمدت کرتا ہے۔ اپنے ملک کی ٹیکنالوجی کو دوسرے ممالک میں فروغ دیتا ہے۔ بعض دفعہ ملک کے اندر بعض ایجادات بھی ثقافتی تغیرات کا باعث بنتی ہیں۔

"کوئی نئی ثقافتی حقیقت، نیا اوزار، سامان حرب و ضرب، الفاظ
یا دوسرے افادی عناصر جو عوام کی بہود کے لیے استعمال کیے
جائیں، وہ بہت جلد سند قبولیت حاصل کر کے ثقافت کا حصہ بن
جاتے ہیں۔ وہ عنصر بطور واحد مد کے اپنے مشاہد اور ہم رنگ
عنصر کے ساتھ تبادلے کے لیے مستعمل ہو گا، اس لیے اس کے
مقابلے میں بہت کم رکاوٹ پیش آئے گی۔"(۳)

ثقافت میں تنوع کا رخ متعین خود بخود ثقافتی عناصر کرتے ہیں۔ لیکن جو ثقافتیں جمود کا شکار ہوتی ہیں، ان کے لیے معاشرے کو خود جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ ایسی صورت میں معاشرہ جن ثقافتی اطوار کو اپنانا چاہتا ہے اسے زیادہ سے زیادہ تقویت دی جاتی ہے۔ تاکہ وہ ترقی پا کر معاشرے میں قبولیت عام کی سند حاصل کر سکیں۔

"ثقافت اظہار جذبات کے نظام اور معروضی اشیاء کے ربط و

ضبط کا نام ہے اور عواطف، رویہ جات اور انواعِ فلسفہ کے

اظہار کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ کسی نئی مشین، رسوم ورواجات،

طریق کار کی ایجاد یا ترویج جلد یا بادیر قائم شدہ نظام کو ابتر

کرنے کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ ایسی تبدیلیاں آغاز میں نہ تو تصور

میں ہوتی ہیں اور نہ ہی متوقع ہوتی ہیں۔ مگر کسی نہ کسی طرح

ظہور میں آجاتی ہیں۔"(۴)

مادی اشیاء پر ثقافتی عناصر کے اثرات بعض دفعہ ایجادات کی مرہون منت ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات یہ اثرات فی الفور نظر نہیں آتے بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ ظاہر ہونا شروع ہوتے ہیں۔ میکانی تغیرات کے نتائج واضح اور صاف انداز میں ثقافت کی تبدیلی میں نظر آتے ہیں۔ مادی عناصر میں جدید عناصر بہت دیر سے وقوع پذیر ہوتے ہیں اس کے مقابلے میں غیر مادی عناصر زیادہ جلد نمایاں نظر آتے ہیں۔ مثلاً ٹیکنالوجی میں آنے والی تبدیلی کے اثرات جلد قبول کر لیے جائیں گے جبکہ گھروں کے طرز تعمیر، اور رہن سہن کے طریقوں میں تنوع وقت کے ساتھ آئے گا۔

ڈاکٹر سید عبد اللہ کلچر کے تغیر و تبدل کا مسئلہ بیان کرتے ہوئے تنوع کو تین اقسام میں تقسیم کرتے ہیں:

"اول: کسی نئے مذہبی، تجربے کا ظہور

دوم: کسی غالب قوم کا حملہ اور فتوحات اور نئے گروپوں کی مداخلت اور معاشرتی اختلاط

سوم: کسی بااثر اور غالب قوم کے تہذیبی اثرات کی یلغار"(۵)

ان تین صورتوں کی وجہ سے کلچر میں تنوع کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ ثقافت میں تنوع کی بڑی وجہ معاشرے کے لوگوں کا تبدیلی کو قبول کرنا ہے۔ بعض اوقات ثقافت میں تنوع کے اثرات اس قدر نظر آتے ہیں کہ ایک زمانے کی ثقافت کو دوسرے زمانے کی ثقافت سے بالکل مختلف تصور کیا جاتا ہے۔ اس طرح کے مسائل ان ثقافتوں میں نظر آتے ہیں جو جمود کا شکار ہو چکی ہوتی ہیں اور اب اس ثقافت کو اپنانے والا کوئی موجود نہیں ہوتا۔

ادب کا تعلق چونکہ معاشرے سے ہوتا ہے اور معاشرہ ثقافت کے تحت چلتا ہے۔ ثقافت میں تنوع کے اثرات واضح ہوتے ہی ادب میں ہی بھی تنوع کے اثرات نظر آتے ہیں۔ ایک ہی علاقے کی ثقافت کو دو مختلف فن پاروں میں بیان کیا جائے تو ان میں بھی تنوع کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ زیر تحقیق مقالہ "ادب اور ثقافت: منتخب اردو ناولوں میں کشمیری ثقافت کے مظاہر میں تنوع کا تجزیہ" میں کشمیری ثقافت پر مبنی دو ناولوں "آگ" اور "برف آشنا پرندے" کو منتخب کیا گیا ہے جو کشمیر کے علاقے "لداخ" کی ثقافت کو بیان کر رہے ہیں۔ ایک ہی علاقے کی ثقافت ہونے کے باوجود دونوں ناولوں میں تنوع کے مظاہر نظر آتے ہیں۔

ناول "آگ" ۱۹۴۶ء میں شائع کیا گیا ہے۔ جس کی اولین اشاعت ۱۹۴۶ء میں ہوئی جب کہ جدید اشاعت ۲۰۱۶ء میں الحمد پبلی کیشنز نے کی ہے۔ جبکہ ترنم ریاض کا ناول "برف آشنا پرندے" ہے، جو ۲۰۰۹ء میں بک کارپوریشن دھلی سے شائع ہوا۔ دونوں ناولوں کی اشاعت میں ۶۳ سال کے عرصے کا فرق پایا جاتا ہے۔ اسی لیے ایک ہی علاقے کی ثقافت ہونے کے باوجود قیام پاکستان کے اثرات، بیسوی صدی کے آخری ۵ دہائیوں کے اثرات اور اکیسوی صدی میں ٹیکنالوجی کے اثرات نے ثقافت میں تنوع پیدا کیا ہے۔

"برف آشنا پرندے" میں ترنم ریاض نے ایک ہی نسل کی کہانی کو بیان کیا ہے جبکہ "آگ" میں عزیز احمد نے تین نسلوں کی کہانی کو بتایا ہے جو کہ ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ ترنم ریاض نے مرکزی کردار کو بطور متکلم کے ذریعے سے کہانی کا پلاٹ بنایا ہے۔ عزیز احمد نے "آگ" میں تینوں نسلوں کی کہانی کو صیغہ غائب کے ذریعے سے بیان کیا ہے۔

فطرتی مناظر کسی بھی علاقے کی پہلی پہچان ہوتے ہیں۔ جمالیات کے ذریعے سے ہی علاقے کی ثقافت کے عناصر کو طے کیا جاتا ہے۔ ثقافت اور جمالیات ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ ثقافت اور نیچر کے تعلق کے بارے میں وزیر آغا لکھتے ہیں:

> "کلچر نیچر کی نابینا آنکھوں کو نور مہیا کرتا ہے۔ اسے فاصلوں اور رفعتوں سے آشنا کرتا ہے۔ اس عمل کو نیچر کی قلب ماہیت کا نام بھی دیا جاسکتا ہے مگر کلچر کا عمل مسلسل نہیں ہے۔ نیچر کی

صورت تو یہ ہے کہ وہ ہمہ وقت زمین سے گویا اُگ رہا ہوتا ہے۔

کلچر اس کی تراش خراش کر کے اسے نکھارتا اور سنورتا ہے۔"(۶)

کلچر کا انحصار فطرت پر ہے۔ جس طرح کا فطرتی ماحول ہو گا، اسی ماحول کے تحت مقاصدِ ثقافت طے کیے جائیں گئے۔ زراعت، جنگلات، حیوانی زندگی اور بحری مخلوق وغیرہ کسی نہ کسی تبدل اور تغیرات کا پتہ دیتی ہے۔ دنیا کی ابتداء کے وقت جب انسان ابھی اتنا ترقی یافتہ نہیں ہوا تھا تو اس وقت کی ثقافت میں اور اکیسویں صدی کے ثقافت میں کافی تنوع پیدا ہو چکا ہے۔ قدرتی عنصر میں تغیر و تبدل اس کا بڑا سبب ہیں۔

کشمیر پوری دنیا میں اپنی خوبصورتی کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ اس لیے کشمیر کو ایشیاء کا دل کہا جاتا ہے۔ کشمیر کی خوبصورتی کو تقریباً ہر مصنف نے کسی نہ کسی زاویے سے بیان کیا ہے۔ کشمیر اپنی خوبصورتی اور رعنائی کی وجہ سے آج بھی ہزاروں سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ فطرتی مناظر کی خوبصورتی ثقافت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ثقافت کو طے کرتے ہوئے قدرتی مناظر کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ ناول "آگ" میں لداخ کے قدرتی مناظر کو بیان کیا گیا ہے۔ لداخ کا علاقہ ہر طرف بلند و بالا پہاڑوں سے گھیرا ہوا ہے۔ عزیز احمد نے اپنے ناول میں کشمیر کی خوبصورتی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ کشمیر ہے۔ جنت نظیر۔ ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید
۔۔۔ پہاڑوں پر جاڑوں میں خوب برف گری تھی اور گرمیوں
بھر برف کے تودے پگھل پگھل کے کھیتوں کو سیراب کرتے
رہے تھے۔ اے عرفی، اے وہ کہ تجھ مرغ کباب کو کشمیر میں
بال و پر ملتے ہیں، دیکھتا جا کہ دریا کے کنارے ہاؤس بوٹوں کے
چھوٹے چھوٹے باغوں کے کناروں کی قطاروں کی قطاریں ہیں۔
پنیری ہیں، تختے کے تختے، نیلے نیلے بڑے بڑے پھول لانبی لا
نبی ٹہنیوں پر ہوا سے جھکے پڑتے ہیں۔ اس ملک میں پھولوں کے
سوا پھل بھی ہوتے ہیں۔"(۷)

جبکہ ترنم ریاض "برف آشنا پرندے" میں کشمیر کی خوبصورتی کے بارے میں لکھتی ہیں:

"سیاحوں نے اسے جنت بے نظیر کا نام دیا تھا کہ قدرت کی جانب
سے ایستادہ بڑے بڑے پہاڑی محافظوں میں گھری یہ برکتوں والی
وادی بغیر کسی باہری امداد کے بڑی خود کفیل بھی تھی۔ اس میں
پھل دار باغ، دھان کے کھیت، زعفران کے معطر کھیتیاں، گھنے
صحت مند جنگل اور پھول اور سبزیاں دینے والی جھیلیں تھیں۔
یہ زمین تو پھل پھول اُگایا ہی کرتی تھیں مگر سبزیاں اور پھول
اُگانے والی اس کی بے مثال جھیلیں کسی عجوبے سے کم نہیں۔"(۸)

ترنم ریاض اور عزیز احمد دونوں نے اپنے اپنے لحاظ سے کشمیر کی خوبصورتی کو دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ دونوں نے کشمیر کے دریاؤں، جھیلوں، درختوں، پھولوں اور پھلوں کا ذکر کیا ہے جو سب مل کر کشمیر کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ کشمیر میں جھیلوں کو نہایت اہمیت حاصل ہے جو اس کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کرتی ہیں۔ یہ جھیلیں نہ صرف کشمیر بلکہ پورے ہندوستان کو سیراب کرتی نظر آتی ہیں۔ اسی لیے یہ خطہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ کشمیر میں بہنے والی یہ جھیلیں سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہیں۔ ترنم ریاض جھیلوں کی خوبصورتی کو بیان کرتی ہوئی لکھتی ہیں:

"ہوٹل کی بالکنی سے نظر آنے والا بے کراں پانی ڈل جھیل
کی طرح کا منظر پیش کر رہا تھا جس میں درختوں والا ایک
چھوٹا سے جزیرہ بھی نظر آتا تھا۔ گویا ڈل کی چار چنار ہو۔
سونالانک یا روپ لانک۔ سونے کی لنکا یا چاندی کی لنکا۔ سنہری
لنکا یا روپہلی لنکا۔"(۹)

عزیز احمد نے ناول میں واضح الفاظ میں جھیلوں کی خوبصورتی کو بیان نہیں کیا، البتہ کشمیر کی خوبصورتی میں مجموعی طور پر جھیلوں کا بھی ذکر ہے جبکہ ترنم ریاض نے جھیلوں کی خوبصورتی کا ذکر بڑے واضح الفاظ میں کیا ہے۔ قدرتی مناظر میں درختوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کشمیر کے درختوں میں چنار کے درختوں کو بڑی واقفیت حاصل ہے۔ چنار کو کشمیری ثقافت میں کشمیری علامت سمجھا جاتا ہے۔ یہ درخت ماحولیاتی لحاظ سے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ دن کے اوقات میں یہ درخت سائے کا سبب ہوتے ہیں۔ کشمیر زبان میں اسے "بون" کہا جاتا ہے جبکہ اسے "شاہی درخت" ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ ترنم ریاض چناروں کی خوبصورتی بیان کرتی ہوئی لکھتی ہیں "چناروں نے ہر طرف گہرے گہرے سائے کر رکھے تھے۔ خزاں کے آمد سے چناروں کے سائے پتے نارنجی ہو گئے تھے۔"[۱۰] عزیز احمد نے "آگ" میں بھی چناروں کی بات اسی طرح کی ہے۔ "ہلکے سنہری دھوپ میں چناروں کے پتے جگمگا رہے تھے اور سفیدوں کے سائے بے حقیقت معلوم ہوتے ہیں۔"[۱۱]۔ عزیز احمد اور ترنم ریاض دونوں نے اپنے ناول میں "چناروں" کے درختوں کے حوالے کثرت سے دیے ہیں۔ جو آج بھی کشمیری ثقافت میں اپنا نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ چناروں کے علاوہ عزیز احمد نے اپنے ناول میں چیڑ، دیوار، صنوبر، بند مجنوں، ابر، زعفران کے درختوں کی بھی بات کی ہے۔ جبکہ ترنم ریاض نے اپنے ناول میں چنار کے علاوہ چیڑ، دیوار، صنوبر کے ساتھ ساتھ گیہوں، سرسوں، تلہن خوبانی، آلو بخارے اور مختلف طرح کی سبزیوں کی کاشت کے بارے میں بھی بیان کیا ہے۔

موسم ثقافتی نصب العین طے کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ کسی بھی علاقے کے موسم کے تحت اس کے رہن سہن کے طریقوں کو طے کیا جاتا ہے۔ برصغیر پوری دنیا میں واحد ایسا خطہ ہے جسے اللہ نے چار موسموں سے نوازا ہے۔ ہر بدلتے موسم کے تحت رہن سہن کے طریقے اور لباس میں تبدیلی آتی ہے مثال کے طور پر گرمیوں کے موسم میں لوگ ہلکے کپڑے پہنتے ہیں جبکہ سردیوں میں موٹے اور اونی کپڑے پہنے جاتے ہیں۔ ترنم ریاض نے اپنے ناول میں خزاں کے موسم کی تصویر کشی نہایت خوبصورت انداز میں کی ہے۔ خزاں کے موسم میں جب پتے جڑنا شروع ہو جاتے ہیں اس وقت کا منظر دلکش اور خوبصورت نظر آتا ہے۔

"خزاں میری اس حسین وادی کے پتوں کے لئے آسمانوں سے

غازہ لئے چلی آتی ہے تو چناروں کی ہریالی قرمزی اور نارنجی ہو کر

نیلے آسمان کے پس منظر میں بہشت کا کوئی ان دیکھا پارہ ہو جاتی
ہے۔ نرم نرم پروں والے گہرے گہرے رنگوں کے برف نیل
گول بادلوں سے مل کر سیدھی اس خطے کی وادیوں، پہاڑوں اور
پانیوں سے رشتہ جوڑنے چلی آتی ہے تو نتیجے میں اس کے دریا اور
چشمے وہ محورِ رقص نظر آتے ہیں اور اس کی جھیلیں اور ندیاں
سیماب ہو جاتی ہیں۔ (۱۲)

عزیز احمد نے اپنے ناول میں خزاں کی منظر کشی نہیں کی البتہ انہوں نے اپنے ناول میں بہار کے موسم کی تصویر کشی نہایت خوبصورت انداز میں کی ہے۔ بہار کے موسم میں جب درختوں سے نئے پتے نکل رہے ہوتے ہیں۔ اس وقت زمیں میں طرح طرح کے رنگ بکھرے نظر آتے ہیں جو ناول "آگ" میں واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

"اپریل کا زمانہ تھا اور کھیتوں میں لالے کے پھول کھلے تھے۔
بڑے بڑے سرخ سرخ کٹورے جیسے پھول۔ لالہ گلاب کا
رقیب، ایرانی شاعری کا محبوب ترین پھول۔ خودرو لالوں کے
کھیت کے کھیت۔ اخروٹ کے درختوں کی بڑی بڑی سفید
کلیوں کے جھنڈ بڑے خوبصورت معلوم ہو رہے تھے۔ سری
نگر کے قریب بادل چھٹ چکے تھے۔ (۱۳)

عزیز احمد نے ناول "آگ" میں موسم بہار کا ذکر کیا ہے جبکہ ترنم ریاض نے "برف آشنا پرندے" میں خزاں کی خوبصورتی کو بیان کیا ہے۔ ترنم ریاض اور عزیز احمد دونوں نے کشمیر میں برف کی منظر کشی کی ہے۔ کشمیر چونکہ پہاڑی علاقہ ہے جہاں سارا سال ہی برف موجود رہتی ہے لیکن سردیوں کے موسم میں برف باری کا منظر ایک خوبصورت اور دلکش منظر ہوتا ہے۔ برف باری کے بعد کے منظر کو پیش کرتے ہوئے عزیز احمد لکھتے ہیں:

"گلیشیر کا برف کل دن بھر کے غسل کے بعد آج آسمان کی نیلی

چادر کے نیچے خالص ترین سفید رنگ میں چمکنے لگا۔ برف کی ایک

دیوار تھی جو گلیشیر سے شروع ہو کے میلوں لمبی وادی میں بڑھتی

چلی گئی تھی۔ یہاں تک کہ دوسرے سرے پر کولوہوئی کے گلیشیر

اور اس کی چوٹی کا برف جگمگا رہا تھا۔"(۱۴)

ترنم ریاض نے اپنے ناول میں برف کے مناظر پیش کیے ہیں۔ برف کے گرنے کے منظر کو ترنم ریاض نے مچھروں سے تشبیہ دی ہے جو مچھروں کی طرح چھوٹی چھوٹی گرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

"پہاڑی سلسلہ شروع ہوتے ہی برف گرتی نظر آئی۔ کبھی مہین تو

کبھی بڑی بڑی سی۔ مہین بھی اتنی کہ جیسے مچھروں سے بھی چھوٹی

مخلوق ہوا میں اڑ رہی ہو اور کسی وقت ایسے موٹے موٹے گالے ایک

ہی سمت ایسے اڑتے جاتے جیسے ابو روٹی کے ننھے ننھے ٹکڑے بنا کر

کبوتروں والے چبوترے کی طرف اُچھالا کرتے تھے۔"(۱۵)

برف کے پگھلانے کے مناظر کشمیر کی خوبصورتی کو مزید چار چاند لگاتی ہے۔ اس خوبصورتی کو دیکھنے کے لیے ہزاروں افراد کشمیر کا رخ کرتے نظر آتے ہیں۔ ترنم ریاض نے کشمیر میں بہار کے موسم میں وقت کی تبدیلی اور برف کے پگھلانے کے مناظر کو بیان کرتے ہوئے دل مولینے والے مناظر پیش کیے ہیں:

"اس روز دھوپ سارا دن چمکتی رہی تھی۔ بادل کا کوئی ٹکڑا سورج

کے راستے میں نہیں آیا تھا۔ برف چھتوں، سے درختوں کی سوکھی

ٹہنیوں اور خزاں زدہ پودوں سے پگھل پگھل کر قطرے بن رہی

تھی۔ ہوا بہت تیز چلتی تو قطرہ تصویروں میں بننے والے قطرے

کی الٹی شکل میں ٹنگارہ جاتا۔ مگر دھوپ کی تیزی آخر اس قطرے

کو پگھلنے پر مجبور کر دیتی۔"(۱۶)

ترنم ریاض نے برف کے پڑنے اور پگھلانے دونوں موسموں کا بیان کیا ہے جبکہ عزیز احمد نے برف باری کے بعد کی منظر کشی کی ہے۔

تاریخ اور ثقافت کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ثقافت میں پائے جانے والے سب عوامل کا تعلق کسی نہ کسی صورت میں تاریخ سے ہوتا ہے۔ جو واقعات، اقدار اور رسوم ورواج ماضی میں قوم نے اختیار کیے ہوتے ہیں، اس سے ثقافت نئی نسل کو حال میں روشناس کرواتی ہے۔ تاریخ جہاں ثقافت کو بنیاد فراہم کرتی ہے وہیں ثقافت تاریخ کے تجربات سے نئی نسل کو روشناس کر کے آئندہ کے لائحہ عمل میں مدد بھی فراہم کرتی ہے، کیونکہ ثقافت ہمیشہ ماضی کے معاشرتی اور سیاسی حقیقتوں کی عکاس ہوتی ہے

"تاریخ در حقیقت ایک خبر ہے جو اس اجتماع انسانی کا پتہ دیتی ہے

جس کو ہم آبادی عالم سے تعبیر کرتے ہیں مختلف ادوار میں مختلف

مقامات پر رہنے بسنے والے انسانوں کی اجتماعی زندگی جن حالات

وحادثات سے گزری ہے اس کی سرگذشت کا نام تاریخ ہے۔"(۱۷)

کسی بھی علاقے کو سمجھنے میں سب سے ضروری چیز اس کی تاریخ سے آگاہ ہونا ہے کیونکہ ثقافت پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا پتہ تاریخ سے ہی ہوتا ہے۔ تاریخ کے ذریعے کسی بھی علاقے پر حملہ آور قوموں کے بارے میں معلومات ملتی ہے۔ تاریخ صرف انسانی زندگی کا ریکارڈ نہیں بلکہ انسانی ارتقاء اس کے کردار کے مطالعے، مخصوص حالات، فطری تقاضوں اور اس کے رد عمل کے بارے میں معلومات کا بھی ذریعہ ہے۔

کسی علاقے کی تاریخ کو متعین کرنا ایک ناممکن مرحلہ ہے کیونکہ دنیا کے آغاز سے ہی تاریخ کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس لیے کسی بھی قبیلے کی تاریخ کو بالکل درست نہیں کہا جاسکتا ہے۔ وقت کے ساتھ دنیا میں افراد کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور انسان مختلف معاشروں میں تقسیم ہوتا گیا۔ قوم کی تاریخ کے تعین کے بارے میں فیض احمد فیض لکھتے ہیں:

"جب ہم تاریخ اور جغرافیہ کی بات کرتے ہیں تو یہ معاشرے کی
قطعی حدود نہیں بلکہ اضافی حدود ہیں۔۔۔ جہاں تک تاریخ کا سوال
ہے جس نقطے سے تاریخ کو شروع کرتے ہیں وہ فرضی نقطہ ہوتا ہے
اس لیے کہ تاریخ تو حضرت آدمؑ سے شروع ہوتی ہے۔ اس اعتبار
سے سب ہی تاریخیں ایک ہی نقطے سے شروع ہوتی ہیں لیکن ہر قوم
اپنے شعور کے مطابق یا اپنی پسند سے ایک نقطہ فرض کر لیتی یا اختیار
کر لیتی ہے۔"(۱۸)

ادب میں کسی بھی علاقے کی ثقافت کو بیان کرتے ہوئے وہاں کی تاریخ کو ضرور بیان کیا جاتا ہے۔ دوسری ثقافتوں کی طرح کشمیری ثقافت کے بیان میں عزیز احمد اور ترنم ریاض دونوں نے کشمیر کی تاریخ کو بیان کیا ہے۔ ترنم ریاض نے کشمیر کی تاریخ کا آغاز پانچ ہزار سال قبل سے کیا ہے۔

"نرم خو، حلیم اور حسین کشمیریوں کی زمین، دانشوروں، فن کاروں
اور دستکاروں کا خطہ، ریشم و پشم، زعفران زاروں اور مرغزاروں کی
سرزمین پہاڑیوں، پانیوں اور وادی کا مسکن یہ کشمیر۔ جنت بے نظیر۔
جس کی پانچ ہزار سال پرانی تاریخ موجود ہے جس کی مثال شاید ہی
دنیا میں کہیں ملے۔"(۱۹)

عزیز احمد کے ہاں کشمیر کی تاریخ کے آغاز میں کوئی تاریخ مختص نہیں کی گئی۔ عزیز احمد نے کشمیری تاریخ کا آغاز بدھ مت سے کیا ہے۔ بدھ مت مذہب کی آمد کے بعد سے کشمیر کی تاریخ ہزاروں سالوں پر مشتمل ہے۔

"بڑے بڑے برف پوش دیوتا دیواروں اور صنوبر کے لبادے
پہنے برستی ہوئی برف میں نہار ہے تھے پھیلتی ہوئی دھند میں حمام

کر رہے تھے اور ایک قافلہ پھر اسی راستے سے گزر رہا تھا جس سے
ہزاروں سال پہلے بدھ مت کے متوالے چینی سیاح نے ہندوستان
کے سفر کے بعد اپنے وطن کا رُخ کیا تھا۔"(۲۰)

تاریخ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بدھ مت کی آمد برصغیر میں ۵ صدی قبل کی ہے۔ ترنم ریاض نے تاریخ کے مطابق ۵ صدی قبل ہی لکھا ہے جبکہ عزیز احمد نے "ہزاروں سال" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ بدھ مت کی آمد کے بعد برصغیر میں دوسری قوموں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ہر قوم نے کشمیری ثقافت پر اپنے اثرات چھوڑے ہیں۔ شمال سے جتنے بھی حملہ آور کشمیر میں آئے انھوں نے کشمیر کی شاہراہ کو ہی اپنا مسکن بنایا۔

"یہ شاہراہ، یہ شہ رگ، کشن خاندان کی شہنشاہیت کو جو ہمالیہ کے
گھوڑے پر سوار تھی، رگِ جان کی طرح مربوط رکھتی تھی۔ اس
راستے سے انسان آئے، مہاجنی نظام آئے، سامراج آئے، جراثیم
آئے، نمدے آئے، مذہب آئے، اس انسان، اس حیوان کے
ساتھ جو کچھ آیا کرتا ہے، سب آیا۔"(۲۱)

بدھ مت کے مذہب کے خاتمے کے ساتھ ہی ہندو مت کے مذہب کا آغاز ہوا۔ یہودی کشمیر کے راستے سے ہی ہندوستان آئے تھے اور پھر یہاں اپنی حکومت قائم کرلی۔ یہودی قوم کی برصغیر میں آمد ۳۲۷ قبل مسیح کی ہے۔ ترنم ریاض لکھتی ہیں:

"سکندر اعظم کے ہمراہ وار ہوئے کچھ یہودی قبائل کے ساتھ وادی
پہنچے ۔۔۔ کشمیر کے کئی مقامات کے نام یہودی ناموں سے ملتے جلتے
ہیں۔ کشمیری پنڈت فرقے کے لوگ ان سے نسبتاً بہت حد تک
مماثلت رکھتے ہیں۔"(۲۲)

عزیز احمد نے کشمیر میں ہندومت کی آمد کا ذکر نہیں کیا البتہ کشمیر میں موجود ہندومت کے اثرات کو اپنے ناول میں بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندومت کی آمد سکندر اعظم کے دور میں ہوئی تھی۔

"مارتنڈ کے مندر کے ویرانے کو دیکھا، جہاں ہر طرف بت شکنی
کے آثار تھے۔ یہ کشمیر کا سومنات ہے۔۔۔ زلزلوں کے آثار اور
سکندر بت شکن کا تعصب، سب نے اس پرستش گاہ کی عظمت پر
ضرب لگانے کی کوشش کی تھی مگر دروازے اور کہیں کہیں اونچی
دیوار اور نقش ونگار اب بھی اس کی پرانی شان وشوکت کی تصویر
آنکھوں میں زندہ کر رہے تھے۔"(۲۳)

دریائے نیل ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ جتنی بھی قومیں کشمیر میں حملہ آور ہوئی ہیں ان میں زیادہ تر کے اثرات دریائے نیل کے پاس ملتے ہیں۔ دریائے نیل کے کنارے تنزانیہ، روانڈہ، یوگینڈا، سوڈان، ایتھوپیا جیسی سلطنتیں آباد ہوئیں۔ اس دریا کے ساتھ کئی کہانیاں وابستہ ہیں کچھ لوگوں کے خیال میں اس راستے کے ذریعے سے برصغیر میں دوسری قومیں خزانہ لایا اور لے جایا کرتی تھیں، کچھ لوگوں کے خیال میں اس دریائے کو دوسرے ممالک کے لوگ صرف تجارت کے لیے استعمال کرتے تھے۔

"کچھ اہم ازکار اور بیانات بھی مصر کی تاریخ سے جڑے ہیں، جس
پر صدیوں تک مقدونیائی نسل کے شاہوں کی حکومت تھی جن کا
ایک اہم شاہد عظیم اور قدیم دریائے نیل بھی ہے۔"(۲۴)

عزیز احمد کے ہاں ہندومت کے بعد مسلم تاریخ کا ذکر کیا گیا ہے۔ مقدونیائی نسل کی حکومت کا ذکر صرف ترنم ریاض کے ہاں ہی ملتا ہے۔ ترنم ریاض نے مسلمانوں کی آمد کا ذکر ۱۲ صدی میں کیا ہے۔

"بارہ سو کے قریب چنار کے درختوں کا باغ نشیم شہنشاہ اکبر نے

صدیوں پہلے ۱۵۸٦ء میں ڈل جھیل کے کنارے بنوایا۔۔۔باغ

کے کناروں پر لکڑی کے کوئی درجن بھر یک منزلہ مکان تعمیر

کئے گئے تھے۔ کشمیر کی سرزمین پر مغلوں کا تعمیر کردہ پہلا باغ

یہی ہے۔"(۲۵)

مسلمانوں نے کشمیر میں آمد کے ساتھ ہی اپنی تعلیمات کا آغاز شروع کر دیا تھا۔ عزیز احمد نے مسلمانوں کی آمد ۱۴صدی میں بتایا ہے ان کے مطابق مسلمان ۱۳۲۴ء میں کشمیر میں آئے۔ ترنم ریاض اور عزیز احمد دونوں نے مسلمانوں کی آمد کی مختلف تاریخیں بتائی ہیں۔ ان تاریخوں میں تقریباً ایک صدی کا فرق پایا جاتا ہے۔

مسلمانوں نے کشمیر میں آمد کے ساتھ ہی پورے ہندوستان میں مذہب اسلام کو پھیلایا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد جب انگریزوں نے پورے ہندوستان پر قبضہ کر لیا تو کشمیر میں سکھ حکومت قائم ہوئی۔ اس وقت کے سکھ راجہ نے انگریزوں کے لاہور میں قبضے کرنے میں ان کا ساتھ دیا جس کے نتیجے میں کشمیر تحفے کے طور پر سکھ راجہ کو ملا۔ کچھ روایات کے مطابق کشمیر کو راجہ نے انگریزوں سے خریدا ہے جس کا ذکر عزیز احمد نے کیا ہے:

"پنجاب کے سکھا شاہی کے زمانے میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے

گلاب سنگھ کو جموں کا راجہ بنایا۔ گلاب سنگھ نے کشمیر پہلے پٹھانوں

سے فتح کیا۔ پھر انگریزوں سے خریدا۔"(۲٦)

ترنم ریاض نے اس روایت کا ذکر نہیں کیا البتہ وہ لکھتی ہیں کہ اس روایت کے مطابق دستاویزی سند موجود نہیں ہے اس لیے اس بات کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا ہے کہ یہ خریدا گیا ہے یا تحفے میں دیا گیا ہے۔ دونوں صورتوں میں راجہ گلاب سنگھ کشمیری عوام کے جسم و جان کا مالک بن گیا تھا اور کشمیری عوام پر من چاہی سختیاں کرتا ہے جس کی عکاسی ترنم ریاض نے کی ہے:

"اس ظلم و جبر کے خلاف اس معصوم خلق نے تنگ آمد بہ جنگ آمد

کے مصداق جب ایک بار ایک اجتمائی جلوس نکالا تو اس میں شامل

شال بافوں اور کاریگروں کو گھوڑوں کے سموں تلے کُچلوایا گیا تھا۔

دریائے جہلم میں پھینک دیا گیا تھا۔ جلوس پر بندوق کی گولیاں نہیں

چلائی گئیں بلکہ بندوق کو لاٹھیوں کی طرح استعمال کر کے اتنا ذدو

کوب کیا گیا کہ لوگ بلبلاتے کراہتے دم توڑ گئے۔"(۲۷)

ترنم ریاض نے اس کے بعد قیام پاکستان کے واقعات کو ناول کا حصہ بنایا ہے جبکہ عزیز احمد نے بیسوی صدی میں قیام پاکستان اور اس کے متعلق چلنے والی تحریکیوں کا ذکر کیا ہے۔ ہندوستان میں تحریک علی گڑھ، جنگ بلقان نے کافی تبدیلیاں رونما کیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد انگریزوں کی پالیسی میں تبدیلی کے اثرات پورے ہندوستان میں نظر آنے لگے۔ پورے ہندوستان کی طرح کشمیر میں بھی قیام پاکستان کی تحریک چلائی گئی۔ جس کی وجہ سے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان جھگڑے معمول کی بات بن گئے تھے۔

"یہ سب جاہلوں کا فساد ہے۔ فرقہ وار فساد۔ اب تک کشمیر اس

فضا سے محفوظ تھا۔ اب یہاں بھی یہ شروع ہو گیا۔ نہیں موسیو

پُرودوں یہ کسی زوایے سے انقلاب فرانس نہیں۔ ابھی کم سے کم

سو سال ہم لوگ حکومت کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ ابھی اس

ملک میں بڑی جہالت ہے۔"(۲۸)

۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد پورے ہندوستان میں کھل کر قیام پاکستان کی تحریک چلائی گئی۔ کشمیر کے کچھ رہنما اس حق میں تھے کہ تحریک چلائی جائے۔

"بغیر ہنگامے کے آزادی نہیں ملتی۔ میرے خیال میں تو اس وقت

لیگ کو بھی کچھ کرنا چاہیے۔ کانگریس کے جیل میں بند ہو جانے کے

بعد اب مسلم لیگ ہی ہندوستان کی سب سے اہم پارٹی ہے۔"(۲۹)

۱۹۴۵ء کی شملہ کانفرس پورے ہندوستان میں نہایت اہمیت کی حامل تھی۔اس کی باز گذشت کشمیر میں بھی سنائی دینے لگی۔شملہ کانفرس میں التوا، پورے ملک میں قیاس آرائیوں کو دعوت دے رہاتھا۔شملہ کانفرس کے التوا اور ناکامی کی ساری ذمہ داری کشمیری رہنماؤں نے قائد اعظم پرڈال دی کہ یہ سب صرف ایک شخص، صرف مسٹر جناح کی ضد کی وجہ سے ہوا ہے۔"اجی یہ پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان میں کیار کھاہے۔اجی جو کچھ ہے ہماراہندوستان ہے۔سارے جہاں سے اچھاہندوستان ہمارا۔"(۳۰)شملہ کانفرس کی ناکامی کے بعد کانگرسی لیڈر ہندوستان بھی گئے جن میں جواہر لال اور مولاناابوالکلام کانام قابل ذکر ہے۔

برصغیر کی تقسیم کے بعد آزاد ریاستوں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ جس کے ساتھ چاہیں اپناالحاق کر لیالیکن کشمیر راجہ گلاب سنگھ نے کسی بھی ملک کے الحاق کرنے سے انکار کر دیا۔لارڈماؤنٹ بیٹن نے بھی کشمیری راجہ کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ ایک ملک میں شامل ہو جائیں لیکن وہ کشمیر کو آزاد ریاست رکھنے پر بضد تھے۔

"ہندوستان کے وزیر داخلہ دلبھ بھائی پٹیل نے یہاں تک اعلان کر
دیا کہ اگر مہاراجہ ہری سنگھ ریاست جموں وکشمیر کا مملکتِ پاکستان
میں انضمام چاہتے ہیں تو مملکت ہند کو کوئی اعتراض نہ ہو گالیکن
مہاراجہ تھے کہ زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد۔حقیقت یہ تھی کہ مہا
راجہ ریاست جموں وکشمیر کو ایک آزاد مملکت کی شکل میں قائم
رکھ کر اس پر مکمل اور دوامی حکمرانی کے خواب دیکھ رہے تھے۔"(۳۱)

کشمیری راجہ کی وفات کے بعد ۱۹۴۸ء میں بھارت نے اپنی فوجیں کشمیر میں داخل کر دی اور پاکستان کی حدود تک پہنچ گیا اور پاکستان پر حملے کی کوشش کی گئی، جس کے جواب میں پاکستان نے بھی کشمیر میں اپنی فوجیں داخل کی۔برطانیہ کی مداخلت کی وجہ سے دونوں ممالک میں جنگ بندی ہوئی۔آج بھی کشمیر کا آدھاعلاقہ پاکستان کے پاس جبکہ باقی علاقے پر بھارت قابض ہے۔

"صوبہ ءجموں میں ایک لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا گیا

ہے۔ اس سے دو گنی تعداد کو جموں و کشمیر کے پاکستانی کنٹرول والے

علاقے میں دھکیل دیا گیا ہے۔ صوبہ جموں جو ایک مسلم اکثریت

والا صوبہ تھا، اب ایک مسلم اقلیتی صوبے میں تبدیل ہو گیا تھا۔"(۳۲)

اب تک کشمیر کو بنیاد بنا کر دونوں ممالک تین بڑی جنگیں لڑ چکے ہیں۔ کہیں دفعہ عالمی سطح پر معاہدہ کی کوشش کی گئی لیکن آج بھی یہ مسئلہ حل طلب ہے۔ تاریخ پر نظر دہرائی جائے تو مسلمانوں کے دور میں ہی کشمیر کی عوام پر کوئی نہ کوئی ریاست قابض رہی ہے۔ ان محکوم قوم میں نا صرف غیر مسلم بلکہ مسلمان قومیں بھی شامل ہیں۔

"کشمیری محکوم ہی رہے۔ صدیوں۔۔ دیکھا جائے تو وادی کا سنہرا دور

سلطان زین العابدین کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔ یوسف شاہ چک کے

مغلوں کے ہاتھوں فریب سے گرفتار ہونے کے بعد کشمیر پر کشمیریوں

کی حکومت رہی ہی نہیں۔ پہلے مغل تھے۔ پھر افغانستان سے افغانوں

نے آخر مظالم توڑے۔ کشمیری کو غیر قوم سمجھ کر تکالیف دیں۔"(۳۳)

عزیز احمد کا ناول چونکہ ۱۹۴۶ء تک کے حالات کی عکاسی کر رہا ہے جس وقت ابھی پاکستان کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا اس لیے ہمیں اس ناول میں اس وقت تک کے اثرات نظر آتے ہیں جبکہ ترنم ریاض نے ۲۰۰۹ء تک کے حالات بیان کیے ہیں اس لیے اس ناول میں قیام پاکستان کے بعد کی عکاسی بھی نظر آتی ہے۔ ترنم ریاض کے ہاں ہمیں قیام پاکستان، پاک بھارت جنگوں اور اکیسویں صدی کے اثرات نظر آتے ہیں جبکہ عزیز احمد کے ہاں صرف قیام پاکستان کی تحریک تک کے اثرات موجود ہیں۔

الف۔ جغرافیائی لحاظ سے ثقافتی تنوع کا جائزہ:

ثقافت میں تنوع کے اثرات ان عوامل پر کم اثر انداز ہوتے ہیں جن کا تعلق جغرافیہ سے ہوتا ہے۔ زبان، معاشرتی رسوم و رواج، رہن سہن کے طریقوں میں تبدیلی لانا ایک سست عمل ہے۔ ثقافت کی تبدیلی کا رفتار کا اندازہ

وجوہات سے آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ ان میں کئی عناصر ایسے ہوں گے جن کے مد مقابل عناصر کے خواص زیادہ مضبوط ہونے کی وجہ سے جلد پُرانے عناصر کی جگہ حاصل کر سکیں گے، جبکہ جن عناصر کا تعلق جذبات سے ہو گا وہ عنصر تبدیلی میں وقت کا تقاضا کرتے ہیں۔

"کلچر کی تشکیل میں کئی عوامل و محرکات کے عمل اور رد عمل کی سی کیفیت ملتی ہے۔ مذہب، قومی فخر و ناز، جغرافیائی حالات، مخصوص ادوار کے اقتصادی حالات اور سیاسی کوائف یہ ہیں وہ چند اہم ترین اور بنیادی عوامل جو عوامی شعور کو بتدریج متاثر کرتے ہوئے قومی کلچر کی تشکیل بلکہ زیادہ بہتر تو یہ ہے کہ تشکیل جدید میں اہم ترین کردار ادا کرتے ہیں۔"[۳۴]

جغرافیائی صورت حال کسی بھی معاشرے کی ثقافت میں اثر انداز ہونے والے عوامل میں سب سے نمایاں ہے۔ جغرافیہ سے مراد قدرتی وسائل مثلاً پہاڑ، دریا، میدان وغیرہ شامل ہیں۔ ہر معاشرہ جغرافیہ کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی ثقافت کو طے کرتا ہے۔ڈاکٹر عبد السلام خورشید اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں "ثقافت تین چیزوں سے عبارت ہے، مذہب، تاریخ اور جغرافیہ۔ تین چیزوں اسے نمو بخشتی ہیں دل، دماغ اور دھرتی۔"[۳۵] پہاڑوں میں رہنے والے لوگوں کا طرز معاشرت میدان میں رہنے والوں سے مختلف ہوتا ہے۔ اسی طرح دریاؤں اور سمندر کے کنارے رہنے والے لوگوں کی طرز معاشرت بالکل مختلف ہوتی ہے۔ رہن سہن کے طریقے ان کے جغرافیے کی وجہ سے مختلف ہوتے جاتے ہیں۔

جغرافیہ کسی بھی علاقے کی پہلی پہچان ہوتا ہے۔ کشمیر اپنے جغرافیے کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ کشمیر کو اس کے جغرافیے کی وجہ سے پورے ایشیا میں اہمیت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ کشمیر میں تین بڑے پہاڑی سلسلے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ایران، پاکستان، بھارت اور چین کو آپس میں ملانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ پاکستان میں

بہنے والے دریا کشمیر سے ہی پاکستان میں داخل ہوتے ہیں۔ کشمیر کا موجودہ جغرافیہ بیان کرتے ہوئے شکیل احمد خواجہ لکھتے ہیں:

"جغرافیائی اعتبار سے کشمیر نہایت اہم خطہ ہے۔ پہاڑوں کے
سلسلوں قراقرم، ہمالیہ اور ہندوکش میں گھرے ہوئے اس
خطے کے شمال میں وسط ایشیاء کی ریاست تاجکستان اور چین کا
علاقہ سنکیانگ ہے۔ اس کے مشرق میں تبت، جنوب میں بھارت
، جنوب مغرب میں پاکستان اور مغرب میں افغانستان واقع ہے۔
اس ریاست کی سرحدین ۵۰۷ میل چین کے ساتھ، ۶۰۰ میل
پاکستان کے ساتھ، ۳۰۰ میل بھارت کے ساتھ اور ۵۰ میل
افغانستان کے ساتھ ملتی ہیں۔ وسط ایشیاء کی ریاست تاجکستان کو
جموں و کشمیر سے واخان کی ایک تنگ پٹی جدا کرتی ہے۔"(۳۶)

ثقافتی تنوع کسی بھی معاشرے کی ثقافت میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مجوزہ موضوع تحقیق میں دونوں ناولوں "آگ" اور "برف آشنا پرندے" کے درمیان ثقافتی تنوع کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ناول "آگ" میں عزیز احمد نے کشمیر کے علاقے "لداخ" کو لینڈ سکیپ کے طور پر استعمال کیا ہے جبکہ اسی علاقے کو ترنم ریاض نے ناول "برف آشنا پرندے" میں بھی بطور لینڈ سکیپ استعمال کیا ہوا ہے۔ "لداخ" کا علاقہ ایک متنازعہ علاقہ ہے۔ ۱۹۴۷ء میں برصغیر کی آزادی کے بعد کشمیر ایک آزاد ریاست کے طور پر سامنے آیا تھا لیکن ۱۹۴۸ء میں بھارت نے کشمیر پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا ہے ۔ بھارت آج تک کشمیر پر قابض ہے۔

"کلچر جغرافیہ کی پیداوار ہے اور ریاست ہمیشہ ایک نئے جغرافیہ
کو وجود میں لاتی ہے، لہٰذا ریاست کے وجود میں آنے کے بعد

اس کی تحویل میں آیا ہوا کلچر اپنی صورت بدلنے لگتا ہے اور اپنی

سرحدوں کے اثرات کے تحت بالآخر ایک نئی شکل اختیار کر لیتا ہے۔"(۳۷)

ناول "آگ" میں عزیز احمد نے قیام پاکستان سے پہلے کا جغرافیہ بیان کیا ہے۔ کشمیر کے جغرافیے کو بیان کرتے ہوئے عزیز احمد لکھتے ہیں:

"ایک طرف پیر پنجال دوسری جانب قراقرم، بیچ میں ریڑھ کی

ہڈی کی طرح ہمالیہ کا سب سے اونچا سلسلہ۔ ان پہاڑوں نے کشمیر

کی ہری وادی، لداخ اور بلتستان کے لق ودق کہساروں۔۔۔"(۳۸)

یہ کشمیر کا جغرافیہ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۴۲ء کے درمیان میں تھا۔ ایک اور جگہ عزیز احمد نے کشمیر کی جغرافیائی حدود بندی کچھ اس طرح کی ہے:

"بارہ مولا سے کشمیر کی اصلی وادی شروع ہوتی ہے۔ اب پہاڑی راستے

کا پُل صراطِ ختم ہو گیا۔ جہلم نے میدانوں تک پہنچنے کے لیے دیوانہ وار

پہاڑوں میں سر پٹکنا چٹانوں سے کشتیاں لڑنا چھوڑ دیا۔ اس طرف، ذرا

دور جہلم بہہ رہی ہے۔ اور سڑک اور جہلم کے درمیان دلدل ہی

دلدل ہے۔ کھیت دلدل ہیں، نالیاں دلدل ہیں اور اس دلدل کے

درمیان ناممکن طور پر تار کول کی سڑک، جانب اونچے اونچے، سیدھے

تنے ہوئے سفیدے کے درختوں کے سہارے اُڑی چلی جا رہی ہے۔"(۳۹)

عزیز احمد نے کشمیر کی حد بندی کرتے وقت کچھ ایسے علاقوں کا ذکر کیا ہے جو اب پاکستان میں موجود ہیں۔ ان میں زیادہ تر علاقے پنجاب کے ہیں۔ کشمیر کو پنجاب کے انھیں علاقوں کے ذریعے پاکستان سے ملایا جاتا تھا۔ ترنم ریاض نے قیام پاکستان کے بعد کی جغرافیائی حدود بندی کی ہے۔ ترنم ریاض کشمیر کی حدود بندی کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"گلگت ریاست جموں و کشمیر کی آخری سرحد تھا۔ اس کے بعد ایک طرف روس اور دوسری طرف چین کی عملداری شروع ہوتی ہے۔ اس خطے کے تحفظ اور مہاراجہ کی افواج کے لئے اسلحہ اور اشیائے خوردنی کی فراہمی کی خاطر کشمیریوں کو بلا اجرت اور بغیر معاوضے تعنیات کیا جاتا تھا۔"(۴۰)

ایک اور جگہ ترنم ریاض کشمیر کے عرض و بلد کا احاطہ کرتے ہوئے علاقوں کے نام سے یوں حدود طے کرتی ہیں:

"ٹنل کی اس طرف کی دنیا۔۔۔ پٹھان کوٹ، جموں، لدھیانہ، کپور تھلہ وغیرہ۔ کچھ افغان علاقے، کچھ پاکستانی شہر، کابل، مزار شریف، جہلم، کوئٹہ، راول پنڈی، گجرانوالہ وغیرہ، بلکہ کچھ وسط ایشیائی خطے بھی جیسے سمرقند، دوشنبے، تاشقند۔"(۴۱)

اگر عزیز احمد اور ترنم ریاض کے ناولوں میں جغرافیائی حد بندی کا موزانہ کیا جائے تو عزیز احمد نے قیام پاکستان سے پہلے کا جغرافیہ لکھا ہے جبکہ ترنم ریاض نے قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں پاک بھارت جنگ بندی کے بعد کشمیر کی تقسیم کا جغرافیہ لکھا ہے جس میں صرف وہ ہی کشمیر کا علاقہ شامل ہے جو بھارت کے قبضے میں ہے۔ ترنم ریاض نے پاکستان میں موجود کشمیر کو ناول میں شامل نہیں کیا ہے اور صرف بھارت میں موجود کشمیر میں پائے جانے والی ثقافتی عناصر کو ہی بیان کیا ہے۔

کسی بھی شخص کے لیے معاشرہ میں اکیلے زندگی گزرنا ناممکن بات ہے۔ انسان کو اپنی ضروریات کے لیے کسی دوسرے پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ جب مختلف لوگ اپنی ضرویات کے تحت اکٹھی زندگی گزرتے ہیں تو معاشرہ بنتا ہے۔ ہر معاشرے میں رہنے کے کچھ اصول طے شدہ ہوتے ہیں۔ یہ اصول ہی معاشرے کی بودوباش کہلاتے ہیں۔ معاشرے کے رہن سہن کے طریقوں کو طے کرنے سے پہلے وہاں کے لوگوں کے مزاج کا معلوم ہونا ضروری ہے۔ مزاج کے علاوہ جغرافیہ، موسمی تبدیلیاں، رسم ورواج اور سب سے بڑھ کر بیرونی اثرات کا بھی ثقافت میں عمل دخل ہوتا ہے۔ یہ دستور

دنیا رہا ہے کہ طاقت ور قوم مظلوم قوم پر حملہ کر کے ان پر اپنی حکومت قائم کرتی رہی ہے۔ جو کہیں نہ کہیں ثقافت پر اپنے اثرات مرتب کرتی نظر آتی ہے۔ڈاکٹر بلوچ ثقافت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ثقافت رہن سہن کو کہتے ہیں۔۔۔ عملی پہلو یعنی نشست و برخاست
کے آداب پیدائش، موت، شادی بیاہ اور دوسری معاشرتی رسوم،
غذا، لباس اور مجلسی زندگی"(۴۲)

کشمیر کے لوگوں کا بود وباش کا طریقہ برصغیر کے دوسرے علاقوں سے منفرد ہے۔ یہاں کے لوگ زیادہ تر مسلمانوں کی طرز معاشرت کو اپناتے ہیں۔ مسلمان برصغیر میں کشمیر کے راستے ہی داخل ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ حکومت کے اثرات نمایاں طور پر کشمیری ثقافت میں نظر آتے ہیں۔ مسلمانوں کے عہد کی بڑی پہچان مسلمانوں کا طرز معاشرت ہے۔ مسلمانوں نے فنون لطیفہ کے ایسے نقوش چھوڑے ہیں جو آج بھی مسلم عہد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ کشمیر کے لوگوں نے بھی مسلمان طرز معاشرت اور فنون لطیفہ کو اپنایا اور اسی طرز معاشرت کے مطابق اپنے مکانات کی تعمیر کی۔

"گلی میں ایک سہ منزلے مکان کے آگے رکا جس پر حال ہی میں
سفیدی پھیری گئی تھی اور سفیدی پر نیلے رنگ کے نقش و نگار
بنائے گئے تھے۔۔۔اس چھوٹے سے آنگن کے چاروں طرف
سہ منزلہ مکان کی تینوں منزلوں کے چوبی چھجے معلوم ہوتا تھا سبز
رنگ میں بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ یہ بیل بوٹے کیا تھے، زیادہ
تر محرابوں کی شکل کے نقش و نگار تھے۔"(۴۳)

ترنم ریاض نے "برف آشنا پرندے" میں چینی بود وباش کے طرز تعمیر کے بارے میں بتایا ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے کشمیر میں بدھ مت کا مذہب موجود تھا جس نے کشمیری ثقافت پر اپنے اثرات مرتب کیے ہیں۔

"سب سے بڑی نچلی چھت کے چاروں گوشوں کے ساتھ

آویزاں کمال مہارت اور فن کاری سے تراشے گئے چوبی
جھومر، جیسے کنول کے پھول چھت کے ہر کونے کے ساتھ
لگے الٹے لٹک رہے ہوں۔ چینی بودھ دہاروں جیسی طرز تعمیر
سے متاثر اس طرح کی عمارت لداخ سے ہوتی ہوئی ریاست میں
خاصی رائج رہی تھیں۔"(۴۴)

مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی مسلمان طرز معاشرت کو اپنایا گیا تھا۔ مسلمان دور حکومت میں بزرگوں اور صوفیاء اکرام کے لیے الگ سے حجرے بنائے جاتے تھے جن کی چھتیاں چوکور طرز کی ہوتی تھیں۔ سارے مکان میں مسلم طرز تعمیر کی طرح نقش ونگار کیے جاتے تھے۔

"حضرت بل کی نئی عمارت بعد میں تعمیر ہوئی۔ ہر نئی عمارت کی
طرح کنکریٹ سے بنائی گئی اور اسی انداز میں جس میں مدینہ
پاک کا روضہ تعمیر ہے۔ جھیل ڈل کے کنارے ایک پُر شکوہ گنبد
اور ایک عظیم مینار۔"(۴۵)

انگریزوں کی آمد کے بعد برصغیر کی ثقافت انگریزی ثقافت سے متاثر ہوئی ہے۔ یہ اثرات ہمیں کشمیری ثقافت میں بھی نظر آتے ہیں۔ اس وقت انگریز پورے ہندوستان میں پھیلے تو دوسری قوموں کی طرح اس نے بھی اپنے اثرات مرتب کیے۔ پہلے مکانات کی طرز تعمیر مسلمانوں کی طرز پر ہوتی تھی، لیکن انگریزوں کی آمد کے بعد کشمیر میں مکانات کی طرز تعمیر وکٹوریہ انداز میں ہونے لگی۔

"والد بزرگوار نے سبھی تمناؤں اور بہت سی محنتوں اور محبتوں
سے تعمیر کروایا تھا۔ یہ بنگلہ۔ وکٹوریں انداز میں۔ چمنیوں اور
ستونوں والا، جس کی سامنے اور عقب کی جانب آٹھ آٹھ

کمروں اور طویل غلام گردشوں والی تین تین منزلیں تھیں اور
اوپر لکڑی کی وسیع بالادری تھی۔ جس کی چھ کی چھ منزلوں کے
زینے پتھروں کی ایک ایک سل سے بنے تھے اور واحد جس کی
پُر شکوہ چھت پر لگا ٹین برس ہابرس، دھوپ سے منعکس ہو کر
اپنے علاقے کے باہر بھی میلوں دور تک نظر آتا۔"(۴۶)

عزیز احمد نے مسلمانوں کے طرز معاشرت پر بنائے گئے مکانوں کا ذکر اپنے ناول میں کیا ہے جبکہ ترنم ریاض نے بدھ مت، مسلم اور انگریزوں کی طرز معاشرت پر بنائے گئے مکانوں کا ذکر تفصیل سے اپنے ناول میں کیا ہے۔

کشمیر میں عمارت کی طرز تعمیر میں فرق آگیا ہے البتہ ابھی بھی مسلمانوں کے فنون لطیفہ کو مختلف طریقوں سے استعمال کیا جاتا تھا۔ جس سے مختلف ثقافتی اشیاء بنائی جاتی تھی۔ جو نا صرف کشمیری ثقافت کی نمائندگی کرتی ہیں بلکہ خوبصورتی کو بڑھنے میں مددگار ثابت ہوتی تھیں۔ ان ثقافتی اشیاء نے مسلمانوں کو پوری دنیا میں الگ پہچان فراہم کی۔ ثقافتی اشیاء میں فنون لطیفہ کے اثرات نظر آتے ہیں۔ جو آج بھی ثقافت کا حصہ ہیں۔ ناول میں ترنم ریاض حقہ، صراحی، تانبے میں بنے مختلف برتنوں کا ذکر کرتی ہیں جس میں چنار کے پتے نقش کیے جاتے ہیں اور اس کے ادھر گرد کشمیر کی خوبصورت وادیوں کی تصویر کشی کے لیے مختلف پھول بوٹے اور پرندے بنائے جاتے ہیں جو کشمیر کی نمایاں پہچان ہیں۔

"اس فن کا وادی کی دستکاریوں پر بھی اثر رہا جن میں چناروں
کے پتوں بلبلوں اور پھولوں کی بیلوں کے ساتھ آگ اُگلتے اژد
ہے بھی نظر آتے جو پیپیئر ماشی کی نقشین دستکاریوں پر مختلف
جاذب رنگوں میں مصور ہوتے اور لکڑی پر بڑی مہارت اور
محنت سے منقش کئے جاتے۔"(۴۷)

کشمیر میں گھروں کی ایک خاص طرز ہوتی ہے۔ وہاں کے لوگ اپنے گھروں کی تزئین وآرائش کے لیے مقامی اشیاء کا استعمال کرتے ہیں جن میں مختلف طرز کے نقش و نگار کیے جاتے ہیں۔ نقش و نگار میں زیادہ تر چناروں کے پتوں کا نقش یا مقامی درختوں کی نقش و نگاری نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف جانوروں کی تصویریں بھی بنائی جاتی ہیں۔

"بدھ کے ہاتھی کے دانت اور جیڈ کے چھوٹے چھوٹے مجسمے جو
تبت اور لداخ کی اعلیٰ کاریگری کے نمونے تھے۔ جیڈ کا ذخیرہ
ان کے پاس خصوصیت سے بڑا اچھا تھا۔ جیڈ کے بھگشو سبز، جیڈ
کا بنا ہوا چھوٹا سا پیکن کے مینار کا چربہ، نیلے جیڈ کا شطرنج کا فرش
اور اس پر ہاتھی دانت کے مہرے۔"(۴۸)

کشمیر میں گھروں کی خوبصورتی کے لیے ہاتھ سے بنی چیزوں کے علاوہ بندوقوں کا بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ عموماً وہ بندوقیں جو اب شکار کے لیے استعمال نہیں ہوتی تھیں انھیں دیوارے ساتھ لٹکا دیا جاتا تھا جو نسل در نسل ثقافتی ورثے کے طور پر چلائی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ حنوط کے ذریعے سے مختلف جانوروں کی اعضائے کو محفوظ کر لیا جاتا تھا اور اسے گھروں کی تزئین و آرائش میں استعمال کیا جاتا تھا۔

"چیتے، بھالو، لومڑی، ہرن وغیرہ کو وہیں حنوط کروا کر گھر کے
دیوان خانے، برآمدے یا بالا دری میں سجایا جاتا۔ صرف سر
اور گردن ہے تو دیواروں پر ٹانکا جاتا اور اگر گولی لگنے سے شکار
کی ظاہری صورت کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا یعنی پورے جسم کی
کھال سلامت ہے تو زندہ و جاوید جیسا حنوط کروانے کے بعد
تختوں پر خشک گھاس اور ٹہنیاں لگوا کر کونے میں ایستادہ رکھا
جاتا۔"(۴۹)

دونوں ناولوں میں کشمیر کی ثقافتی اشیاء کا ذکر کیا گیا ہے جو کشمیر کی نمائندگی پوری دنیا میں کرتی ہیں۔ کشمیری قالین پوری دنیا میں اپنا نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ کشمیر کی ثقافت میں کشمیری قالین کو اہمیت حاصل ہے۔ کشمیری قالین کی ہزار سالہ تاریخ موجود ہے جسے عزیز احمد نے اپنے ناول میں تفصیلاً بیان کیا ہے۔ عزیز احمد نے جس کشمیری خاندان کو موضوع بنایا ہے وہ قالین فروش کا خاندان ہے جو قالینوں کی اقسام کے ساتھ ساتھ پوری قالینی تاریخ کو بھی بتاتے ہیں۔

" سینکڑوں قالین، دیواروں پر لٹکے ہوئے قالین، لپٹے ہوئے اور
اہرام مصر کی طرح چھوٹے چھوٹے مخروطی مینار سے بناتے ہوئے
قالین۔ آدھے کھلے ہوئے، آدھے بچھے ہوئے۔ کشمیری اونی قالین
بچھا ہوا تھا۔ "(۵۰)

قالین کی مختلف اقسام کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ کشمیر میں "کاشانی، شیرازی، بخاری، اندجانی، مشہدی، کشمیری" قالین بنائے جاتے ہیں۔ قیام پاکستان سے پہلے ہاتھ سے بنے والے قالین پوری دنیا میں مشہور ہیں۔

"ماوراء النہر میں سمرقند اور بخارا کے سوا کاریگر کہیں باقی نہیں
مگر کشمیر میں کاریگر افراط سے ہیں۔ اس زمانے میں طرح طرح
کاریگر کشمیر میں بیٹھتا تھا اور قالین کے سوا دوسرے ہنر، کاریگر
صنعت میں کمال کر دیتا تھا۔ "(۵۱)

لیکن اکیسوی صدی میں ٹیکنالوجی کی وجہ سے قالین بافی کی صنعت میں ہاتھ سے زیادہ مشینوں پر کام کیا جاتا ہے ۔ کشمیر میں قالین کی تیاری پہلے سے قدرے کم ہو گئی ہے۔ جس پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ترنم ریاض لکھتی ہیں:

" چاندی کے چھوٹے بڑے اور تانبے کے، عام جسمامت سے
بڑے منقش برتن، شاہ توس کے دوشالے، پشمینے کے تھان،
کشمیری ریشمی قالین اور ایرانی غالیچے کہاں غائب ہو گئے۔ "(۵۲)

عزیز احمد کے ہاں قالین بافی کی صنعت کو نمایاں دیکھا گیا ہے جبکہ ترنم ریاض نے موجود دور کی عکاسی کی ہے جب قالین بافی کی صنعت کشمیر میں ختم ہونے کے قریب ہے۔ اب کشمیر میں ہاتھ سے قالین کم بنائے جاتے ہیں۔ مشینوں کے ذریعے بنائے جانے والی قالینوں کی صنعت کئی مقامات میں قائم ہے۔ جس میں ثقافتی عکس کی جھلک نظر آتی ہے۔

انسان اپنے خیالات کے اظہار کے لیے زبان کو استعمال کرنا موزوں سمجھتا ہے۔ کسی بھی معاشرے کی زبان میں اس کی ثقافت کا عکس نظر آتا ہے۔ معاشرے کی تاریخ، روایات، رہن سہن کو جاننے کا اولین ذریعہ زبان ہی ہوتی ہے۔ فرد جب کسی دوسری ثقافت کو جاننے کی کوشش کرتا ہے تو سب سے پہلے وہاں کی زبان سیکھتا ہے۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس نے کسی دوسری زبان کا اثر قبول نہیں کیا۔ ہر زبان میں دوسری زبان کے الفاظ شامل ہوئے ہیں۔

"زبان ہماری ثقافت کا ایک سائنٹفک حصہ ہے جس کے ذریعے
ہم اپنے بچپن میں اپنی ثقافت کے بنیادی اصول سیکھتے ہیں اور
اس کے ذریعے ہم ایک دوسرے سے اپنے مطالب کا اظہار
کرتے ہیں۔ یہ عمل ماضی سے جاری ہے اور مستقبل تک جاری
رہے گا اور ثقافت کے معیار اور تصورات کا ابلاغ ہوتا رہے گا۔
پس زبان کے مختلف نقوش کم از کم الفاظ اور ان کے معانی،
ہماری ثقافتی بنیادوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔"[۵۳]

زبان کی ترویج کے ساتھ اس میں تبدیلی آنا ایک فطری عمل ہے۔ دنیا میں اس وقت پانچ ہزار سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن بعض ماہرین ان کی تعداد تین ہزار بتاتے ہیں، اس کی بڑی وجہ کچھ زبانیں اتنی محدود علاقوں یا خاندانوں میں بولی جاتی ہیں جسے ماہرین بڑی زبانوں میں شامل ہی نہیں کرتے ہیں۔ جو زبان وقت کے ساتھ تبدیلی کو قبول کرتی ہے وہ زندہ رہتی ہیں باصورت دیگر زبان بولنے کے افراد میں کمی کے ساتھ وہ زبان بھی محدود ہو جاتی ہے۔

عزیز احمد نے ناول "آگ" میں کشمیری زبان کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی دوسری زبانوں کو بھی استعمال کیا ہے۔ اس لیے ہمیں کشمیری زبان میں کشمیر کی تاریخ بھی نظر آتی ہے۔ کشمیر کی مقامی زبان میں ہندی، فارسی، بنگالی اور ایرانی کے اثرات نظر آتے ہیں۔

"بتے می تراشد ز سنگِ مزارے۔ فارسی میں کاشمر بھی کہتے ہیں
رخت بہ کاشمر کشا کوہ وتل ودمن نگر۔ تبت والے اسے کشال
کہتے ہیں اور گریز والے کشرات، بروزن حشرات، یعنی حشرات
الارض والے حشرات۔"(۵۴)

ترنم ریاض کے ہاں بھی مقامی زبانوں کے الفاظ کا استعمال نظر آتا ہے۔ جن میں ہندی زبان بھی شامل ہے۔

"ارے پگلی اگر میں خوش نہ ہوتی اپنے جیون سے تو کیا تم کو
آواز بدل کر پریشان کرنے کا موڈ ہوتا میرا۔ وہ سب اب
میں بھگوان پر چھوڑ دیا ہے۔ اور دشواس کرو کی میں سچ مچ
نشچنت ہو گئی ہوں میری سکھی۔"(۵۵)

عزیز احمد نے مقامی الفاظ کے ساتھ ساتھ انگریزی الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے۔ عزیز احمد نے انگریزی زبان کے الفاظ کو مقامی لہجے میں بولنے کی کوشش کی ہے جس طرح کشمیر میں وہ لفظ ادا کیے جاتے ہیں "ہم گورنمنٹ شرونٹ ہے۔ سروے آپھ انڈیا کی رپورٹ دینے جلدی واپس ہونے کے حکم پر آیا۔"(۵۶) ناول "آگ" ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا ہے لیکن اس میں وقت ۱۹۰۸ء سے شروع ہوا تھا جب انگریزی زبان ابھی بین الاقوامی زبان کے طور پر نہیں بولی جاتی ہے۔ انگریز چونکہ کافی عرصے سے برصغیر پر قابض تھے اسے لیے انگریزی زبان ہمیں عزیز احمد کے ناول میں نظر آتی ہے۔ ترنم ریاض کا ناول ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا جب انگریزی زبان کو بین الاقوامی زبان ہونے کا درجہ حاصل ہو چکا تھا۔ وقت کی تبدیلی کے ساتھ کشمیری زبان پر بھی اثرات مرتب ہوئے۔ جس کا عکس ترنم ریاض کے ناول میں نظر آتا ہے۔ ترنم ریاض نے اپنے ناول میں انگریزی زبان کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔ "فار دی ڈیکیڈس۔۔۔ اینڈ ٹو کاؤنٹر دیز

فیک ری اے لیٹیز،وی مسٹ ہیو۔۔مسٹ ہیو۔۔دی۔۔دی"(۵۷) انگریزی جملوں کے علاوہ ترنم ریاض اردو جملوں میں بھی انگریزی زبان کا استعمال کرتی نظر آتی ہیں۔

"یہ والا لیٹر مجھے بھی آیا ہے۔۔۔انٹر یسٹنگ آفر ہے یہ۔۔اور

یہ دوسرا بھی۔ہاں یہ۔۔یہ یاد ہے۔کب اپلائی کیا تھا ہم نے

فیلوشپ کے لئے۔کینیڈا۔اب سال بعد۔"(۵۸)

ترنم یاض کے ہاں انگریزی زبان کا استعمال زیادہ کیا گیا ہے جبکہ عزیز احمد نے انگریزی الفاظ کا استعمال قدرے کم کیا ہے اور زیادہ تر الفاظ کو کشمیری لہجے میں استعمال کیے گئے ہیں۔

کشمیری زبان میں کئی ایسے اردو کے الفاظ ہیں جنھیں کشمیری لہجے میں بولا جاتا ہے۔کشمیری زبان میں حضرات کے لیے " حض" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اسلام علیکم کے لیے" سلام علیک"، عزت کے لیے "اجت"،غریب کے لیے "گریب" پریم منسٹر کے لیے "پریم مشڑ" اجازات کے لیے "ازازت" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔یہ الفاظ عزیز احمد نے اپنے ناول "آگ" میں استعمال کیے ہیں۔کشمیری اور انگریزی زبان کے علاوہ ناول میں ہندی زبان کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ ناول کا لینڈ سکیپ "لداخ" کا ہے جو ابھی تک بھارت کے قبضے میں ہے۔ہندی بھارت کی سرکاری زبان ہے۔ محکوم قوم ہمیشہ ہمارے اثرات غلام قوم پر ڈالتی ہے۔ ناول میں " پتی"،"درشن"،" کھاپا"،"نینوں"،"پتی"،"سنجوگ"،"سندر"،"وشواس" وغیرہ کا استعمال نظر آتا ہے۔

کشمیری زبان بھی دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح کئی زبانوں سے متاثر ہوئی ہے۔ان زبانوں میں مقامی زبانوں کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت انگریز ڈیڑھ صدی سے زیادہ وقت برصغیر میں گزر چکے تھے اور انہیں حکومت سنبھالے ہوئے بھی تقریباً ایک صدی گزر چکی تھی۔کشمیری زبان میں انگریزی زبان کے کئی الفاظ مکمل طور پر شامل ہوگئے ہیں۔ ان الفاظ میں "وارننگس"،"بی ہے ویئر"،"اتھاریٹز"،" ڈویلوپ"،"رول موڈل"،"ریسپیکٹ"،"سائی کائٹرسٹ"،"آئی ایم شیوئر" وغیرہ شامل ہے۔ یہ الفاظ عزیز احمد اور ترنم ریاض دونوں نے اپنے اپنے ناولوں میں استعمال کیے ہیں۔

ثقافت کی نمائش میں رسم ورواج اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ رسم رواج کا انسانی زندگی میں بڑا عمل دخل ہے۔ انسان پیدائش سے لے کر موت تک تمام کام اپنے رسوم ورواج کے تحت کرتا ہے۔ ان رسوم وراوج میں مذہب کے ساتھ ساتھ مقامی روایات کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ مقامی روایات، تاریخ، رہن سہن کے طریقے سب مل کر رسم و رواج طے کرتے ہیں۔ ہر علاقے کے رسم ورواج دوسرے علاقے سے مختلف ہوتے ہیں۔ رسم وراوج میں وقت کے ساتھ تبدیلی آتی رہتی ہے، لیکن کسی بھی رسم کو ثقافت کا حصہ بننے کے لیے صدیوں کا وقت درکار ہوتا ہے۔ اس لیے معاشرے کے ہر فرد کے لیے لازم ہوتا ہے کہ وہ ان رسومات کی پابندی کریں۔

"کلچر میں وہ رسم ورواج شامل ہیں جس میں تعلیم، جانکاری، یقین،
ہنر، اصول، قانون، ایسی ہی مختلف خوبیاں عادتیں شامل ہوتی ہیں
جنہیں انسان سماج کے ممبر کے ناطے حاصل کرتا ہے۔ ٹیلر کے
مطابق کلچر سے ہمارا مطلب اس "سب کچھ" سے ہوتا ہے جسے
انسان اپنی سماجی زندگی میں سیکھتا ہے یا سماج سے حاصل کرتے ہیں۔"[۵۹]

ہر ادب میں اس علاقے کی ثقافت کی عکاسی کی جاتی ہے، اس لیے دیکھنے میں آیا ہے کہ ثقافت میں تبدیلی کے ساتھ ہی ادب میں بھی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ ترنم ریاض اور عزیز احمد دونوں نے کشمیر اور خاص طور پر "لداخ" کی ثقافت کی عکاسی کی ہے جس کے درمیان تنوع نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ عزیز احمد نے اپنے ناول میں شادی کی رسومات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ شادی کے معاملات لڑکے اور لڑکی کے والدین طے کرتے ہیں۔ کشمیری قاعدے کے مطابق مسلمان خاندانوں میں لڑکیوں کی شادی جلد کر دی جاتی ہے ۔ کشمیر میں بارات کی آمد پر انھیں بیٹھک نما کمرے میں بیٹھا جاتا ہے جہاں کشمیری قالین بچھائے جاتے تھے۔

"خواجہ صاحب کی بیٹھک میں بڑے بڑے سرخ کشمیری اور
سمرقندی قالین بچھائے گئے۔ رنگی ہوئی منقش دیواروں سے
لگا کے جابجا تکئے اور گدے لگائے گئے۔ صدر میں کشمیری

ریشمی کاڑھے ہوئے کام کا چغہ پہن کے دولھا بیٹھا اور چاروں

دیواروں سے ملے ہوئے باراتی اور مہمان بیٹھے۔۔۔سب

متین، سب خاموش سب سنجیدہ۔"(۶۰)

ترنم ریاض کشمیر کے رسوم ورواج کی عکاسی کرتے ہوئے شادی کی رسومات بیان کی ہیں۔ شادی میں بارات کے استقبال کرتے ہوئے چند جملے ادا کیے جاتے ہیں جنھیں بدائی کے گیت کہا جاتا ہے۔ جو اس علاقے کی خاص پہچان ہیں:

"سلام عرض کرتے ہیں دولہے میاں

کہ آپ آئے تو جگ منور ہوا"(۶۱)

عزیز احمد اور ترنم ریاض دونوں نے اپنے اپنے صنف کے متعلق بارات کے استقبال کے منظر کو پیش کیا ہے۔ عزیز احمد نے مردوں کی طرف استقبال کی اہم چیزیں پیش کی ہیں جبکہ ترنم ریاض نے عورتوں کی طرف ہونے والے استقبال کو بیان کیا ہے۔

ناول "برف آشنا پرندے" میں بتایا گیا ہے کہ بدائیوں میں بارات کے استقبال کے ساتھ ساتھ لڑکی کو دعا دی جاتی ہے کہ وہ اپنے سسرال میں خوش وآباد رہے۔ "باری واریواندہ لگِہ نے"(۶۲) علاقے کے رسم ورواج کے مطابق مسلمان خاندانوں میں نکاح کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ جس کے بعد طعام کا اہتمام ہوتا ہے۔ نکاح اور طعام کی رسومات کے بعد دلہن کو رخصت کیا اور اس کے ساتھ علاقی گیت گائے جاتے ہیں۔

"بابل نے پتھر کیا دل تو بھیجا

اس انگنا کی چڑیا کو پربت کے پار"(۶۳)

عزیز احمد نے بدائیوں کے بارے میں کچھ بھی اپنے ناول کا حصہ نہیں بنایا۔ البتہ طعام اور دوسری رسومات کا ذکر کیا ہے جس کا ذکر ترنم ریاض کے ہاں نظر نہیں آتا جیسے وہ لکھتے ہیں کہ نکاح کے رسم کے بعد "سلامی" کی رسم ادا کی جاتی ہے جس میں شادی میں شریک لوگ دولہے کو نقد رقم کے ذریعے کچھ "سلامی" دیتے ہیں جو ان کی آئندہ زندگی میں کام آتی ہے۔ ان رقوم کو باقاعدہ لکھا جاتا ہے جو اس علاقے کی رسم ہے۔

"جناب یہ ہم اس کے پرچے میں اس واسطے لکھوایا ہے کہ
جب ہماری بیٹے کی شادی ہو گا تو خواجہ صاحب بھی ہمارے
بیٹے کو پانچ روپیہ دے گا۔ اس طرح بدل پورا ہو جائے گا۔
جناب یہ ادھر کا طریقہ ہے۔ سب ایک دوسرے کے ساتھ
برابر سلوک کرتا ہے۔"(۶۴)

کشمیر میں مسلم خاندانوں میں گانے بجانے کی محفلیں کم منعقد کی جاتی ہیں۔ زیادہ تر علاقی بدائیوں کے ساتھ لڑکی کو رخصت کیا جاتا ہے۔ ترنم ریاض نے دلہن کی رخصتی پر بات کرتے ہوئے بتایا ہے کہ پرانے زمانے میں دلہن کو بغیر کچھ کھائے پلائے "ڈولی" میں سوار کیا جاتا تھا تاکہ ڈولی لے جانے والے کے لیے آسانی رہے اور راستے میں مشکلات سے بچا جا سکے۔

"اور دلہنوں کو ڈولی اٹھنے سے پہلے دو دن تک بھوکا اور پیاسا رکھا
جاتا تھا کہ گاڑیاں ہوتی نہیں تھیں۔ برات ناؤ میں آتی یا پیدل
۔ڈولی کہار اٹھاتے تھے۔ اور ڈولی کے ساتھ ملحقہ غسل خانہ تو
ہو نہیں سکتا تھا۔ دلہن بے چاری نیم مردہ حالت میں سسرال
پہنچتی تھی۔"(۶۵)

عزیز احمد کے ہاں دلہن کے رخصتی کی رسومات کو نہیں بیان کیا گیا ہے۔ جبکہ ترنم ریاض نے اس رسم کو تفصیلاً بیان کیا ہے۔

لوک گیت شادی کی رسومات میں اہمیت کے ساتھ ساتھ اہم ثقافتی ورثہ ہوتے ہیں جو ہر زبان میں موجود ہیں۔ ہر زبان کے لکھنے والے لوگ ان لوک گیتوں کو کسی نہ کسی طرح محفوظ کرتے ہیں تاکہ آئندہ نسل تک اس کو پہنچایا جا سکے۔ لوک گیت علاقائی رسم ورواج کے علاوہ لوگوں کے مزاج، خیالات اور جذبات کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ ایک

علاقے کے جذبات، خیالات اور مزاج دوسرے علاقے سے مختلف ہوتے ہیں جس کی وجہ سے یہ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ ہر علاقے کے لوک گیت دوسرے علاقے سے مختلف ہوتے ہیں۔

"لوک موسیقی سے زیادہ کسی اور موضوع کے متعلق اس قدر
غلط فہمیاں موجود نہیں۔ عوام تو ایک طرف، ماہرین بھی اس
حقیقت سے بے خبر ہیں کہ لوک گیت اور کہانیاں ذہنی
تخلیقات کا اعلیٰ سرمایہ ہیں جو دنیا کی ہر ثقافت کی جان ہیں۔" (٦٦)

ترنم ریاض نے شادی کی رسومات کے ساتھ لوک گیت کو بھی ناول کا حصہ بنایا جو شادی کے موقع پر عورتیں اپنے پسندیدہ انسان سے محبت کے اظہار کے لیے گاتی ہیں۔ یہ لوک گیت موقع محل کے مطابق تبدیل میں ہو جاتے تھے۔

"جے توں اکھیاں دے سامنے نئیں رہنا
تے بیبا ساڈا دل موڑ دے" (٦٧)

ایک اور جگہ ترنم ریاض لکھتی ہیں:

"شالیاں کٹنے کی رُت میں گائیں کیوں کر بالیاں
غنچے مرجھائے بہت سے، سوکھی ساری ڈالیاں
خوش طبع، خوش شکل، خوش اطوار بانکے کیا ہوئے
پھول پھل کی وادیوں میں خار کیوں اگنے لگے۔" (٦٨)

عورتیں لوک گیت کے ساتھ ساتھ علاقائی رقص کا مظاہر بھی کرتی ہیں۔ یہ علاقائی رقص ہر علاقے کے مختلف ہوتے ہیں۔ کشمیری رقص کی تصویر کشی ترنم ریاض یوں کرتی نظر آتی ہیں:

"عورتیں ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے چھ چھ سات

سات کی تعداد میں جنگلا سا بنا کر پاؤں بدل بدل کر لوک گیت

گایا کرتیں دو جنگلے بنائے جاتے باری باری گانے کے لئے۔ اور

کبھی کبھی چار بھی۔ "(۶۹)

عزیز احمد نے "آگ" میں لوک گیت کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی علاقائی رقص کے بارے میں ثقافتی عنصر کا مظاہر کیا ہے۔

علاقے میں شادی کے رسومات کے علاوہ کچھ دیگر رسومات بھی پائی جاتی ہیں۔ ان رسومات کا تعلق کہیں نہ کہیں مذہب سے ضرور ہوتا ہے۔ مذہب انسانی زندگی پر حاوی رہتا ہے۔ کشمیر میں ایک اہم مذہبی رسم "نوروز" منائی جاتی ہے۔ جو بنیادی طور پر تو ہندو مت کی رسم ہیں لیکن مسلم خاندانوں میں یہ رسم آج بھی ادا کی جاتی ہے۔ اس رسم کی عکاسی عزیز احمد نے اپنے ناول میں کی ہے۔ یہ رسم پورے برصغیر میں منائی جاتی تھی۔ آج بھی یہ رسم پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش میں انتہائی احترام کے ساتھ منائی جاتی ہے۔ یہ رسم موسم بہار کے آغاز میں ادا کی جاتی ہے جو پنجابی مہینے "بیساکھی" کی ۱۵ کو منائی جاتی ہے یا ۲۱ اپریل کو ادا کی جاتی ہے۔

"آج بیساکھی کی وجہ سے زیادہ تر ہندو اور پنڈت ہی آتے تھے۔

آج کشمیر کا نوروز تھا اور نیا سال شروع ہو رہا تھا۔ دونوں طرف

بھنے ہوئے چنے، تال مکھانے، لڈو تل کی چیزیں، کچوریاں،

پکوڑیاں اور اسی طرح کی چیزیں بک رہی تھیں۔ "(۷۰)

ترنم ریاض نے "نوروز" کی رسم کا ذکر اپنے ناول میں نہیں کیا ہے۔ کشمیر میں مذہبی تعلیم کی شروعات میں چند رسومات ادا کی جاتی ہیں۔ یہ رسومات مذہب اسلام سے تعلق رکھتی ہیں۔ مسلم گھرانوں میں قرآن مجید کی تعلیم سے پہلے "بسم اللہ" کی رسم ادا کی جاتی ہے جس میں خاندان کے بڑے بچے کے علم میں اضافے کے لیے "دعا" کرتے ہیں اور اس کے بعد طعام کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہ رسم بچے کے چار سال ہونے پر ادا کی جاتی ہے جس کے بعد بچہ باقاعدہ طور پر تعلیم کا آغاز کرتا ہے۔

"ہمیشہ چار سال چار مہینے چار دن کے بعد ہر لڑکے کی بسم اللہ
ہوتی تھی۔ جس میں کوئی لولابی یا "بخاری" ملا قرآن شریف
کی کوئی سورت طوطے کی طرح پڑھاتا۔ پھر شیرینی تقسیم ہوتی
اور رات کو گوشتابے اور آب گوشت اور پورے چالیس طرح
کے کھانوں سے سارے ہم چشموں کی دعوت ہوتی۔ بسم اللہ
کے بعد فارسی عربی کی ملا صاحب کے ہاتھ تعلیم ہوتی۔ "(۷۱)

یہ رسم کشمیر میں شاہ ہمدان کے زمانے سے چلی آرہی ہے۔ مسلمانوں میں یہ رسم ایک مذہبی حیثیت رکھتی ہے۔ اس رسم کے بعد ہی مسلمان بچے اپنی تعلیم کا آغاز کرتے ہیں۔ کشمیر کے علاوہ پنجاب کے مختلف علاقوں میں آج بھی یہ رسم ادا کی جاتی ہے۔ ترنم ریاض کے ہاں "بسم اللہ" کی رسم کا ذکر نہیں ملتا۔ ان کے ہاں صرف شادی کی رسومات کا ذکر کیا گیا ہے۔ باقی علاقائی رسومات کو انھوں نے اپنے ناول کا حصہ نہیں بنایا۔

ہر علاقے کے کھانے اس کی خاص پہچان ہوتے ہیں۔ ہر علاقہ کچھ مخصوص کھانوں کو اپنی ثقافت کا حصہ بناتا ہے۔ یہ کھانے اس علاقے کے لوگوں کے مزاج کی عکاسی کرتے ہیں۔ پنجاب کے رہنے والے لوگ مکھن، مکئ کی روٹی جیسی خوراک کو پسند کرتے ہیں جبکہ پہاڑی علاقوں میں رہنے والے لوگ گوشت سے بنی ہوئی چیزوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جو ان کی ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے شوق مزاج کی عکاس بھی ہوتی ہیں۔ وقت کی تبدیلی کے ساتھ ہی کھانوں کی پسند میں بھی تنوع آجاتا ہے۔ پہلے زمانے میں لوگ زیادہ تر دیسی کھانوں کو پسند کرتے تھے جبکہ جدید دور میں دیسی کھانوں کے ساتھ ساتھ فاسٹ فوڈ کو بھی اہمیت دی جاتی ہے۔

"کھانے پینے پر بھی ثقافتی مغائرت کے اثرات نمایاں معلوم
ہوتے ہیں۔ خالص اور سادہ خوراک کا تو تصور ہی "ہائی
سوسائٹی" میں ناممکن ہے۔۔۔ رفتہ رفتہ نیند سے لے کر کھانا پینا
،اٹھنا بیٹھنا، پہننا اوڑھنا تک سب بدل گیا۔ "(۷۲)

دنیا کی دوسری ثقافتوں کی طرح کشمیری ثقافت بھی تنوعات کے اثرات سے دوچار ہوئی ہے۔ جس کا اظہار اردو ادب میں نظر آتا ہے۔ عزیز احمد نے ناول "آگ" میں کشمیری کھانوں کا ذکر کیا ہے جس میں انہوں نے کشمیر کی قدیم روایتی کھانوں کا ذکر کیا ہے۔ صبح کے کھانے کا ذکر کرتے ہوئے عزیز احمد لکھتے ہیں "کاریگر اور معمولی حیثیت کے لوگ پراٹے خریدنے لگے۔ صبح کا وقت ہی ایسا ہوتا ہے جب کشمیر میں گیہوں کی چیزیں کھائی جاتی ہیں۔"(۷۳) ترنم ریاض نے کشمیری کھانوں پر بڑی تفصیل سے بات کی ہے۔" نمکین چائے اور مکئی کی روٹیوں اور گیہوں کے آٹے سے بنے دو دو پیڑے والے پراٹھوں کے ساتھ تازہ مکھن کی خوشبوئیں دور دور تک پھیل کر کسی ان دیکھی ڈور سے باندھ کر آناً فاناً میں انہیں گھر کے قریب پہنچا دیتی۔"(۷۴) ترنم ریاض نے ناشتے کا باقاعدہ ذکر نہیں کیا لیکن کھانے اور موقع محل کی تصویر کشی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ وقت ناشتے کا ہے کیونکہ گیہوں سے بنی چیزیں کشمیری ناشتے میں بہت شوق سے کھاتے ہیں۔

دن اور رات کے کھانے میں گوشت سے بنی چیزیں زیادہ پسند کی جاتی ہیں۔ یہ وہاں کے لوگوں کی ضرورت بھی ہے۔ گوشت میں پروٹین اور دوسرے اجزاء کی وجہ سے جسم کو حرارت ملتی ہے اس لیے پہاڑی علاقوں میں رہنے والے گوشت سے بنی چیزوں کا استعمال زیادہ کرتے ہیں۔

"ہر قاب میں چار چار آدمی کھانا کھاتے تھے۔ رکابیاں نہیں
تھیں۔ اسی سینی میں چار طرف چاولوں کے چار ٹکڑے ہوتے
جاتے۔ ہر ایک کو مٹر کا شوربہ، ترکاری کا شوربہ، آب گوشت،
کوفتوں کا سالن اور اس قسم کے بے شمار کشمیری سالن دیتا جاتا۔
ہر قاب میں کچھ تازہ چاول رکھے گئے۔"(۷۵)

ترنم ریاض نے بھی دن اور رات کے کھانے کا منظر ناول میں بیان کیا ہے۔

" بکرے کی ران کی گول بوٹیوں اور باسمتی چاولوں سے خالص
گھی، عمدہ مصالحے، خشک میوے، زعفران اور نہ جانے کیا کیا

استعمال کر کے۔"(۷۶)

دونوں ناولوں میں کھانے کی بھرپور تصویر کشی کی گئی ہے۔ کشمیر میں کشمیری چائے کو نہایت اہمیت حاصل ہے۔ یہ چائے کشمیری ثقافت کی بھی عکاسی کرتی ہے جس میں مقامی چائے کے ساتھ مصالحہ جات کو شامل کیا جاتا ہے۔ کشمیری چائے پوری دنیا میں اپنی منفرد پہچان رکھتی ہے۔۔ "نوجوان گروہ جو گنجفہ کھیل رہا تھا، نمکین گاڑھی کشمیری چائے کی پالیاں دے کے۔"(۷۷) ترنم ریاض نے ناول "برف آشنا پرندے" میں کشمیری چائے کو بیان کیا ہے۔ کشمیر کے اندر وباہر اس نمکین چائے کو گلابی چائے یا کشمیری چائے کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کو بنانے کے طریقے میں تبدیلی لائی جارہی ہے اور اسمیں سوڈا ملا کر پیا جاتا ہے۔

"جب تک بچے بے ضرر، سیاہ پتی والی سوڈا ملا کر پکائی گئی بیگنی رنگ
کی دودھ ملانے کے بعد گلابی ہوئی لذیذ چائے کے ساتھ کلچے باقر
خوانیاں نوش کر چکے ہوتے کہ وادی میں خوراک کا ایک اہم جز صبح
اور شام کو نمکین چائے والا ناشتہ ہوتا۔"(۷۸)

یہ سوڈا ملا کر کشمیری چائے بنانے کا رواج لکھنو میں تھا۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ کشمیر میں بھی ترویج پا گیا ہے۔ سوڈا ملا کر چائے بنا اب کشمیری ثقافت کا عنصر بنتی جارہی ہے۔ وہاں کے لوگوں کے ہاں اب دونوں طرح کی چائے بنائی جاتی ہے۔

"وہ سیاہ پتی ہوتی ہے اور صحت کے لئے نسبتاً اچھی بھی۔ پھر اس
میں سوڈا بائکارب استعمال ہوتا ہے۔ جو سٹمک کی ہلکی پھلکی ایلمنٹ
میں مفید ہوتا ہے۔ سوڈیم بائے کاربونیٹ، میٹھا سوڈا، لکھنو میں بھی
چائے پی جاتی ہے۔"(۷۹)

کشمیری چائے کے علاوہ وہاں کی باقر خانیوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کشمیر کے علاوہ پورے پنجاب اور خاص طور پر مشرقی پنجاب میں بھی باقر خانیوں کو بڑی شوق سے کھایا جاتا ہے۔ کشمیر میں باقر خانیوں کو تلنے کی بجائے دم دے کر بنایا جاتا ہے۔

"سارا سارا دن بید کی ٹوکری میں کلچے، باقر خانیاں قہوے یا نمکین
گلابی چائے سے بھرے، تانبے کے قلعی کئے گئے بڑے سے منقش
سماوار کے ہمراہ چبوترے پر پہنچائی جاتیں۔"(۸۰)

عزیز احمد باقر خانیوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"قالین سے ذرا ہٹ کے ایک لمبا سا میز تھا، جس پر کیک، پیسٹری،
سینڈوچ، باقر خانیاں، سیو دال، سموسے، تلے ہوئے گوشت کے
ٹکڑے، نمکین پستے، بادام، اخروٹ اور دنیا بھر کی چیزیں چنی ہوئی
تھیں۔"(۸۱)

دونوں ناول نگاروں نے کشمیر کی ثقافت کے نمایاں کھانوں کا ذکر کیا ہے۔ علاقے میں خاص ایام مثلاً شادی ،مرگ کے موقعوں پر طعام کا خاص انتظام کیا جاتا ہے۔ جو عام دنوں سے مختلف ہوتا ہے۔ کشمیر میں کھانا کلچر کے مطابق نیچے بیٹھا کر دیا جاتا ہے جس میں آداب طعام اور فارسی کے اشعار درج ہوتے ہیں۔ مہمانوں کو کھانے کے لیے ترتیب سے دستر خوان پر بیٹھایا جاتا ہے اور ان کے سامنے دستر خوان لگایا جاتا ہے۔ عموماً مہمان دیوار کے ساتھ بیٹھتے ہیں۔ کشمیر میں کھانے کے برتن بھی مقامی روایات کے مطابق ہوتے ہیں جس میں بیک وقت کئی لوگ کھانا کھاتے ہیں۔

"ایک ایک طبق چار چار آدمیوں کے لیے تھا۔ چار جگہ کباب،
شوربہ اور بوٹیاں تھیں۔۔۔ چاولوں کے لقمے کے ساتھ گوشت
کا پہلا نوالہ بسم اللہ کر کے منہ میں رکھا۔ نوکر چھوٹے چھوٹے

پیالوں میں دوسرے سالن دینے لگے۔ مٹر کا شوربہ، آلو کا

قورمہ، گوشتابہ، کوفتے، مرچوں کا سرخ قورمہ، ترکاری کا ساگ

اور آب گوشت۔"(۸۲)

مقامی کھانوں میں گوشت اور چاول کے علاوہ حلوے کو بہت پسند کیا جاتا ہے۔ ہر موقعے پر خواہ وہ موقع خوشی کا ہو یا غم کا حلوے کو کھانے کا ایک اہم حصہ سمجھا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ مہمانوں کی خاطر تو ضع کے لیے بھی اس مقامی ڈیش کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس کھانے کو بنانے کے لیے مقامی لوازمات کو بھی استعمال میں لایا جاتا ہے۔ ترنم ریاض لکھتی ہیں:

"سینی میں چاندی کے ورق سے ڈھکا کا سوجی کا حلوہ رکھا ہے۔

(اور زعفران والے، زردم نرم نرم حلوے کے اندر بادام، کاجو

، پستہ، چلغوزے، کشمش اور اخروٹ کی گریاں تو ہوتی ہی ہیں)۔"(۸۳)

عزیز احمد نے شادی بیاہ میں کیے جانے طعام کے بارے میں بھی تفصیل سے لکھا ہے جبکہ ترنم ریاض نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ترنم ریاض نے کشمیری کھانے "شب دیگ" کا ذکر کیا ہے جسے کشمیری ثقافت میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ "شب دیگ پک رہی ہے نا۔ وہ تو رات بھر پکے گی نا۔۔۔ شلغم مصالحے اور جانے کیا کیا۔۔(۸۴)" یہ کھانا روایتی موقعوں میں پکایا جاتا ہے جس میں مذہبی ایام کے ساتھ ساتھ مقامی سطح پر منائے جانے والے ایام شامل ہیں۔

لباس انسان کے جسم کو ڈھانپنے کا واحد اور بہترین ذریعہ ہے۔ لباس ناصرف روایات کی پاسداری کرتا ہے بلکہ یہ نظریات و خیالات کا بھی عکاس ہوتا ہے۔ کوئی بھی معاشرہ لباس کے انتخاب میں معاشرے کے مقاصد کو مد نظر رکھتا ہے جو ثقافت کو بناتے وقت طے کیے جاتے ہیں۔ اس لیے یہ بات مشاہدہ میں آئی ہے کہ مشرق کا لباس مغرب سے مختلف ہے۔ ہر معاشرہ کچھ اصول طے کرتا ہے جسے ہر فرد مانتا ہے۔

"انفرادی طور پر ہر فرد کی زندگی دوسرے فرد سے کم و بیش

مختلف ہوتی ہے۔ لیکن ایک قوم کے لوگوں میں بہت کچھ

مشترک بھی ہو سکتا ہے۔ ان کے لباس میں بہت یکسانیت ہوتی
ہے۔ ان کی خوراک میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ ان کی پوشاک،
ان کی رہائش، ان کے مکان اور رسم و رواج ہی چیزیں باہم ہم رنگ
اور دیگر اقوام سے متمائز ہوتی ہیں۔"(۸۵)

اردو ناول میں کشمیری ثقافت کے دیگر عناصر کی رونمائی کی طرح لباس کے بارے میں بھی تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔ کشمیر کی اپنی ثقافت ہے جو اسے دنیا کی ثقافتوں سے ممتاز اور منفرد بناتی ہے۔ "شملا" کشمیری ثقافت میں نہایت اہمیت میں حامل تھا۔ کشمیر میں مرد اس کا استعمال لباس کے ساتھ ہر موقع پر کرتے ہیں۔ وقت کی تبدیلی کے ساتھ جب کشمیری عوام نے کوٹ پتلون کا استعمال شروع کیا، تو کوٹ پتلون کے ساتھ شملے پہننے لگے۔ جو اب کشمیری ثقافت میں ثقافتی لباس کی نمائندگی کرتا ہے۔

"اباجی نے گہرے نیلے رنگ کا کوٹ پتلون پہن رکھا تھا جو تصویر
میں سیاہ نظر آتا تھا۔ ان کا شملے والا سفید طرّہ البتہ سفید ہی نظر آتا
تھا۔ نیلی نک ٹائی بھی سیاہ معلوم ہوتی تھی۔"(۸۶)

عزیز احمد نے بھی "شملا" جو کشمیری ثقافت میں نمایاں مقام رکھتا ہے کی بات ناول میں کی ہے۔ "شملا" عموماً خاندان کے بڑے بزرگ استعمال کرتے ہیں۔ برصغیر کے تمام علاقوں میں "شملا" کو عزت کی علامت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

"خواجہ صاحب سرمئی رنگ کا موٹا پشمینے کا چغہ اور پٹو کی برجیس
پہنے، سر پر صافہ باندھے، حنائی داڑھی میں ایک ہاتھ کی انگلیاں
پھرتے۔۔۔ پورے مجمع میں سب سے زیادہ اہم شخصیت خواجہ
صاحب کی تھی۔"(۸۷)

کشمیر میں "شملا" کے علاوہ کشمیری ٹوپی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کشمیری ٹوپی پر کشمیری ثقافت کے مطابق مختلف قسم کے ڈائزین اور تزئین و آرائش کی جاتی ہے۔ "عرشوں میں کشمیری ٹوپیاں پہنے اور کمبل اوڑھے ہوئے ہانجی چھوٹے چھوٹے حقے گڑ گڑا رہے تھے۔"(۸۸) ترنم ریاض نے ناول "برف آشنا پرندے" میں کشمیری ٹوپی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں "شیخ صاحبان تو قمیض شلوار پر واسکٹ پہنتے ہیں اور سر پر قراقلی ٹوپی"(۸۹) کشمیر میں ٹوپی پہننے کا رواج زیادہ ہے۔

کشمیر ایک پہاڑی علاقہ ہے جہاں سارا سال سردی رہتی ہے جس کی وجہ سے وہاں پر موٹے اور اونی کپڑوں کا استعمال زیادہ کیا جاتا ہے۔ "جاڑوں میں پشمینے کا لبادہ اور اس کے اوپر کبھی ایک موٹا سا کمبل، کبھی توسہ اوڑھے رہتے۔ سفید سوتی کپڑے کا چغہ اور شلوار پہنتے۔"(۹۰) ترنم ریاض کے ہاں کسی مخصوص موسم کے لحاظ سے لباس کو موضوع نہیں بنایا گیا ہے البتہ کشمیری ثقافت کے مطابق لباس کا ذکر ضرور ملتا ہے۔

کشمیر میں عورتیں "پھیرن" کا استعمال کرتی ہیں۔ "پھیرن" کو مقامی لباس میں نہایت اہمیت حاصل ہے۔ عورتیں آج بھی مقامی لباس میں "پھیرن" کو زیادہ اہمیت دیتی ہیں۔ خاص طور پر شادی بیاہ کے موقعے میں "پھیرن" کو ثقافت کی رونمائی کے طور پر لازمی پہننا جاتا ہے۔

"رنگ رنگی کانگڑیوں کو گلے میں لٹکائے کانگڑی والے کا چہرہ
پھولوں میں چھپا معلوم ہوتا ہے۔ اور جب اس نے انہیں گلے
سے نکال کر زمین پر رکھا تو شیبا نے دیکھا کہ اس نے پھرن
نہیں پہنا تھا۔ وہ ہر اصل انسل کشمیری کی طرح حسین تھا
اور اس نے جیکٹ پہن رکھی تھی۔"(۹۱)

عزیز احمد نے بھی عورتوں کے لباس کے بارے میں بات کرتے ہوئے "پھیرن" کو بڑی اہمیت دے ہے۔ عزیز احمد کے ہاں اس کی تصویر کشی یوں کی گئی ہے۔

"گورے گورے رنگ، کبھی سانولے رنگ، عورتوں کے

وہی گیر دار پھیرن، کوئی عورت ذرا مختلف وضع کا پھیرن
عموماً صاحب معلومات میں اضافے کرنے کے اطراف کو
رسی پہنے گزرتی۔"(۹۲)

کشمیری لباس "پھیرن" عورتوں کا ثقافتی لباس ہے۔" پھیرن" کے علاوہ کشمیری عورتیں ہاتھ سے کڑھائی کیے گئے ملبوسات کا استعمال کرتی ہیں۔ ان لباسوں میں زیادہ تر ریشمی لباس ہوتے ہیں۔ انگریزوں کے دور سے ہی کشمیر میں ریشمی کپڑے بنانے کے کارخانے قائم کر دیئے گئے تھے۔ آج بھی کشمیر کا ریشمی کپڑا پوری دنیا میں مشہور ہے۔ مقامی عورتیں ریشمی کپڑے سے شلوار قمیض بنواتی تھی۔

"باجی نے گہرے گلابی رنگ کے کشمیری ریشم کا شلوار قمیض
پہن رکھا تھا۔۔۔ گہرے گلابی رنگ کا سوٹ جا بجا فیروزی رنگ
کے ریشمی دھاگوں سے کاڑھا گیا تھا۔"(۹۳)

عزیز احمد اپنے ناول "آگ" میں بتاتے ہیں کہ کشمیر میں عورتیں زیادہ تر مقامی لباس کا استعمال کرتی ہیں البتہ کچھ عورتیں ایسی ہیں جو شلوار قمیض پہنتی ہیں۔ ان میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو دوسرے علاقوں سے ہجرت کر کے یہاں آئے ہوئے ہیں۔

"شالامار میں لوگ کم تھے۔ مگر ایک جگہ ڈھلوان سبزے پر کچھ
عورتیں تھیں۔ عورتیں ڈوگرے کپڑے پہننے تھیں۔ لمبے
کرتے چوڑی دار پاجامے اور اوڑھنیاں مگر وہ لڑکیاں جو ساتھ
تھیں شلوار قمیض میں تھیں۔ وہ ہلکے گلابی رنگ کے کپڑے پہنے
تھی۔"(۹۴)

کپڑوں پر دھاگوں سے کڑھائی کے علاوہ ستارے موتی اور مقیش کا استعمال کیا جاتا ہے جس سے مختلف طرز کے پھولوں کے ڈیزائن بنائے جاتے ہیں۔

"سیاہ ریشم کی قمیض کے دامن پر کڑھی پتلی سی بیل سے میچ کرتا
ہوا امی کا ایک پرانا مگر بڑا ہی حسین دوپٹہ اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔
جس نے اس کے لباس کے حسن دوبالا کر دیا تھا۔۔۔ شبیا نے اپنے
پائینچوں کی طرف دیکھا کہ پائینچوں پر بھی قمیض کے دامن والی
نیلی ہری بیل کڑھی کی تھی اور امی کے دوپٹے میں انھیں رنگوں کی
دھاریاں تھیں۔"(۹۵)

عورتوں کے علاوہ شادی بیاہ کے موقعے پر دولہا بھی بھاری اور کام ہوئے لباس کا استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح بارات میں شامل لوگوں کے لباس بھی ململ اور ریشمی کپڑے سے تیار کردہ ہوتے ہیں۔

"صدر کشمیری ریشمی کاڑھے ہوئے کام کا چغہ پہن کے دولھا
بیٹھا۔۔۔ لمبے لمبے چغے پہنے ہوئے سروں پر صافے، کالی
ڈاڑھیاں، حنائی ڈاڑھیاں، سفید ڈاڑھیاں ترشے ہوئے لب،
کچھ لوگ پشمینے یا رفل کی شالیں اوڑھے ہوئے۔"(۹۶)

ترنم ریاض کے ہاں شادی کے ملبوسات میں کوئی بات نہیں کی گئی ہے۔ عزیز احمد مردوں کے لباس پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں "ایسے ہی چغے پہنے ہوئے، اسی طرح کی شالیں اوڑھے ہوئے یہی سفید اور حنائی ڈاڑھیاں، یہ وسط ایشیا ہے۔"(۹۷) البتہ کشمیر میں دوسرے علاقوں کے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو اپنے مقامی لباس کا استعمال کرتے ہیں۔

"پنجاب کے بڑے بڑے زمیندار، لکڑیوں کے بڑے بڑے ٹھیکے
دار، بمبئی کے مشہور تاجر سبھی قسم کے لوگ ٹھہرے تھے اور

لباسوں میں بھی یہی تنوع تھا۔ ریشمی شلواریں، جارجٹ کی چھاپے

کی ساریاں، سلیک، اونی پل اوور، سب ہی طرح کے لباس۔"(۹۸)

عزیز احمد نے کشمیر میں دوسرے علاقوں کے ثقافتی لباس کو بھی بیان کیا ہے۔ جو وقت کی تبدیلی کے ساتھ کشمیری ثقافت کا حصہ بن گئے ہیں جس کی عکاسی ترنم ریاض نے اپنے ناول میں کی ہے۔ کشمیری لباس میں تنوع سے مردوں کے لباس بھی متاثر ہوا ہے۔ پہلے مرد "چغہ" استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اب "چغے" کے ساتھ پتلون اور قمیض کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔

"اس نے بہت سی جیبوں والی کسی نرم کپڑے کی سیاہ قمیض پہن

رکھی ہے۔ اور پتلون خاکی رنگ کی ہے۔ اس نے گلے کے

اطراف خاکی اور سیاہ خانوں والا ایسے ہی کسی نرم سے روئیں والے

کپڑے کا گلوبند ڈال رکھا تھا۔"(۹۹)

کشمیری عورتیں لباس کے ساتھ زیورات کا استعمال بھی کرتی ہیں۔ کشمیری ثقافت میں عورتیں کے لباس کے ساتھ زیورات کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ عورتیں زیادہ تر چاندی کے زیورات کا استعمال کرتی ہیں۔ جو ان کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔

" ننگے پیر، آفتابہ اٹھائے، وہ ندی کی طرف چلی جارہی تھی اور ملمع

کئے زیور اس کے سر اور کانوں سے لٹکے ہوئے چھن چھن بج رہے

تھے۔ دونوں کانوں میں کنواج تھے، کنجیوں کے لچھے کی طرح، اور

لچھوں میں پانچ پانچ کڑے تھے۔ دوریا آویزے جن میں ملمع کئے

گولے لٹک رہے تھے۔ کنواج اور دور کے وزن سے کان پھٹ ہی

پڑتے، اس لیے تالازر یعنی چاندی کی ایک پتلی سی زنجیر دور کو پیشا

نی سے باند ھتی تھی۔ وزن کے ہاتھوں میں لنگن تھے جن میں دور

دور پر شیشے کے سرخ اور ہرے ٹکڑے جڑے ہوئے تھے۔ گلے

میں مرجان کا ایک ہار تھا اور نقش کی ہوئی گولیوں کا دوسرا ہار تھا۔

دونوں ہاتھوں میں سات ساتھ دانے تھے۔"(۱۰۰)

یہ زیورات کئی قسم کے قیمتی پتھروں سے بنے ہوتے ہیں۔ جو تبت، لداخ اور ماوراء النہر میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ان زیورات میں نیلم، یاقوت، فیروزے، لاجود، کرسٹل کی طرح کے قیمتی پتھر استعمال ہوتے ہیں۔

"شوکیسوں میں جواہرات، سینکڑوں قسم کے بیش قیمت اور کم

قیمت پتھر، لعل اور نیلم سے لے کر لیپس لزولی اور کرسٹل تک،

ہار بازوبند، پہنچیاں، ست لڑے، جھمکے، بڑی بڑی معمولی

پتھروں سے بے ہنگم طور پر پراٹی ہوئی مگر بڑی ہی فیشن ایبل

تبتی انگوٹھیاں۔ اسی طرح کے تبتی آویزے۔"(۱۰۱)

کشمیر میں ان زیورات کا خاصی اہمیت حاصل ہیں۔ سیاح کشمیر میں سیاحت کے دوران ان زیورات کو دیکھنے اور خریدنے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں۔

"نیم قیمتی پتھروں کے چینی اور تبتی زیورات جو کشمیر کے سیاح

ضرور خریدتے ہیں ان کے پاس بافراط تھے اور نیلم، لاجورد، سینڈ

سٹون اور تمام نیم قیمتی پتھر جو تبت، لداخ اور ماوراء النہر میں

کثرت سے پائے جاتے ہیں، تبتی یاقوت ارزق اور لاجورد سے

جڑی انگوٹھیاں، بڑے بڑے فیروزوں سے جڑی ہوئی پرانی زنگ

آلود تبتی پہنچاں ماوراء النہر کے چاندی کے پتروں میں جڑے

ہوئے زمرد کے ہار۔"(۱۰۲)

عزیز احمد نے زیوارات کے متعلق تفصیل سے بیان کیا ہے جبکہ ترنم ریاض نے کشمیری زیوارات کو اپنا موضوع نہیں بنایا ہے۔

ب۔ اعتقادی اعتبار سے ثقافتی تنوع کا جائزہ:

ثقافت اور مذہبی عوامل کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ کسی بھی ثقافت کے نصب العین اور مقاصد کو مذہب کے تناظر میں طے کیا جاتا ہے۔ علاقے کی رسومات، رہن سہن کے طریقوں حتیٰ کہ شادی اور موت کے طریقوں کو طے کرتے ہوئے بھی مذہب کو اہمیت دی جاتی ہے۔ مذہب معاشرتی اقدار مثلاً نیکی، بدی کے معیارات کو طے کرتا ہے۔

"مذہب اور اس کے اصول وعقائد اس کا نظام فکر و عمل دراصل ایک نصب العین اور ایک آدرش کا درجہ رکھتا ہے جسے ہمیں حاصل کرنا ہے تاکہ ہم زندگی کی خیر کے عناصر کے ساتھ بہتر طور پر بسر کرسکیں۔ اسی لئے مذہبی اصول وعقائد کی ہماری زندگی میں بنیادی اہمیت ہے۔"(۱۰۳)

وقت کے بدلاؤ نے مذہب پر اثرات مرتب کیے ہیں۔ ہر آنے والی نئی قوم اپنے ساتھ اپنا مذہب لے کر آئی۔ حاکم قوم ہمیشہ اپنے مذہب کی بالادستی کرواتی رہی ہے، جوں ہی مذہب میں تبدیلی آئی ساتھ ہی ثقافت میں بھی اس کے اثرات نظر آنے لگے ہیں۔ کچھ مذہبی عوامل ایسے بھی ہیں جو براہ راست مذہب سے تعلق نہیں رکھتے لیکن بلواسطہ طریقے سے مذہب سے منسلک ہیں۔ جن میں مذہبی اساطیر اور توہمات شامل ہیں۔ ہر علاقے کی کچھ خاص توہمات اور اساطیر ہیں جن کے اثرات ثقافت میں نمایاں ہوتے ہیں۔ اساطیر میں وقت کی تبدیلی کے ساتھ کچھ نہ کچھ کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ توہمات میں وہ تمام قصے شامل ہیں جو لازماً نہیں کہ مذہبی ہوں۔ انسان نے قدرت کے بارے میں چند قصوں کو بنایا اور پھر ان پر عمل پیرا ہوگئے۔ ان قصوں میں زیادہ تر وہ قدرتی عوامل شامل ہیں جس نے کسی نہ کسی طرح انسان کو

متاثر کیا ہے۔ وقت کی تبدیلی اور جدید ٹیکنالوجی کی وجہ سے ان توہمات اور اساطیر میں کافی حد تک تبدیلی آچکی ہے البتہ ابھی بھی ان کے اثرات ہمارے معاشرے میں واضح نظر آتے ہیں۔

"قدیم انسان کی زندگی کا یہ دور شعور کی نئی نویلی فعالیت کا دور تھا۔
ایک طرف اس کے ہاں وجود تلاش کرنے کا رویہ ابھرا جو اروح
کی دریافت پر منتج ہوا اور دوسری طرف اس نے جادو کی رسوم کی
مدد سے فطرت کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے یا ڈھالنے کی
کوشش کی۔۔۔ غور کیا جائے تو یہ کوشش کلچر کے تحت ہی شمار ہو گی۔"(۱۰۴)

کلچر کی عکاسی میں مذہب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے ہر علاقے کا مذہب مختلف ہوتا ہے۔ اس لیے ہر علاقے کی ثقافت بھی ایک دوسرے سے مختلف نظر آتی ہے۔ مذہب کی اہمیت پر بات کرتے ہوئے میتھو آرنلڈ لکھتا ہے:

"مذہب جو انسان کی ان کوششوں میں جن کے ذریعے بنی نوع
انسان نے خود کو کامل بنانے کے جذبے کا اظہار کیا ہے، سب سے
زیادہ اہم اور سب سے زیادہ عظیم کوشش ہے لٰہذا مذہب اور
ثقافت دونوں ایک ہی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔"(۱۰۵)

اسے لیے ہر ناول نگار ثقافت کی عکاسی کرتے ہوئے مذہب کا ذکر ضرور کرتا ہے۔ عزیز احمد نے کشمیر کا کلچر بیان کرتے ہوئے وہاں پائے جانے والے سارے مذاہب کا ذکر کیا ہے جو کسی نہ کسی دور میں کشمیر کا حصہ تھے اور ان کے اثرات ابھی تک کشمیری ثقافت میں موجود ہیں۔ عزیز احمد نے کشمیر میں مذہب کی تاریخ کا آغاز بدھ مت سے کیا ہے۔ ناول کے آغاز میں ہی عزیز احمد لکھتے ہیں:

"ایک قافلہ پھر اسی راستے سے گزر رہا تھا جس سے ہزاروں سال
پہلے بدھ مت کے متوالے چینی سیاح نے ہندوستان کے سفر کے

بعد اپنے وطن کا رخ کیا تھا۔"(۱۰۶)

ترنم ریاض نے بھی کشمیر کی تاریخ کے دوران ان مذہب کا ذکر بھی کیا ہے جو کشمیر کی ثقافت پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ کشمیر کی تاریخ کا آغاز بدھ مت سے ہوا تھا۔ بدھ مت نے کشمیر سے اپنا مذہب پھیلانا شروع کیا۔

"بودھ مت کے ایک مخصوص فرقے کے پیروکار اس راجہ کو،

بودھ کی تعلیمات کے مختلف انداز سے اپنائے گئے معنی کے

سبب پیدا ہوئے کنفوژن کو دور کر کے ایک نیا تری پٹکا ترتیب

دینے کی خاطر کانفرس منعقد کرنا مقصود تھی۔ اب بھی تانبے

کی تختیوں پر کندہ وہ سربمہر گنجینہ اسی سرزمین میں دفن ہے۔

یا عشروں سے بودھ عابدوں اور دانشوروں کے سینوں میں

کسی مخصوص وقت تک منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ غالباً یسوع

مسیح کے نسل در نسل منتقل ہو رہے۔"(۱۰۷)

بدھ مت نے کشمیر سے اپنی تعلیم کا آغاز کیا اور یہاں سے پورے برصغیر میں پھیلے ہیں۔ کشمیر میں "لداخ" میں بدھ مت کا مذہب زیادہ پھولا پھیلا ہے۔ بدھ مت کے مذہب کے پھیلاؤ کے بارے میں عزیز احمد بتاتے ہیں کہ ہر گھرانے سے جو لڑکا اور لڑکی ان کے سپرد کیے جاتے ہیں وہ جوان ہو کر بدھ مت کی تعلیم کو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پھیلاتے تھے۔

"یہ لداخی تبت مارکہ کے بدھ مت کے قائل ہیں۔ "گن پا" جو ان

کی خانقاہیں ہیں، ان میں لاکھوں کا سونا ہے۔ ہر خاندان کسی نہ کسی

"گن پا" کو اپنا ایک لڑکا اور ایک لڑکی سپرد کرتا ہے۔ لڑکے بڑے

ہو کر لاما اور لڑکیاں کومو کہلاتی ہیں اور سب لاسا کے لامائے اعظم

کی معتقد ہوتی ہیں۔"(۱۰۸)

ترنم ریاض اور عزیز احمد دونوں نے کشمیر میں مذہب کے آغاز بدھ مت سے بتایا ہے۔اور تاریخی حوالوں سے دونوں نے ثابت کیا ہے کہ کشمیر میں پہلا مذہب بدھ مت کا ہی تھا۔

بدھ مت کے بعد مختلف ادوار میں مختلف مذاہب کو اپنایا جاتا رہا ہے۔ کبھی ہندو مت کے ماننے والے غالب رہے ، کبھی ناگ دیوتا کو ماننے والے۔ بدھ مت کے اختتام پر کشمیر میں پھیلنے والا مذہب ہندو مت تھا۔ ہندو مت کے لوگ کشمیر کی پہاڑیوں کو بہت مقدس سمجھتے ہیں۔ ان کے عقیدے کے مطابق ان پہاڑیوں میں ان کے خدا موجود ہیں جو یہاں پر مسند پر بیٹھا کر ان کی قسمت کے فیصلے کرتے ہیں۔ ہندو مت کے نزدیک ہمالیہ کی پہاڑیاں آج بھی بہت مقدس سمجھی جاتی ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر کے نام ہندو مت سے ہی لیے گئے ہیں۔

"سکندر اعظم کے ہمراہ وارد ہوئے کچھ یہودی قبائل کے ساتھ
وادی پہنچا۔ کشمیر کے پہاڑوں پر رہنے والے اب بھی اسرائیل
نام شوق سے رکھتے ہیں اور کشمیر کے کئی مقامات کے نام یہودی
ناموں سے ملتے ہیں۔ کشمیری پنڈت فرقے ہندو مت میں بھگو
ان کو کئی دیوی دیوتاؤں میں بانٹ دیا گیا ہے اور ان کے خیال
میں یہ اچھا ہی ہوا ہے کے لوگ ان سے نسبتاً بہت حد تک
مماثلت رکھتے ہیں۔"(۱۰۹)

ہندو مت کے مذہب کو ایک زمانے میں بڑا عروج حاصل ہوا۔ سکندر اعظم کے آمد اور بادشاہ دار شکور کی شکست کے بعد ہندو مت کے مذہب کو کشمیر میں ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے البتہ آج بھی ہندو مت مذہب کے آثار کشمیری ثقافت میں نظر آتے ہیں۔

"مار تنڈ کے مندر کے ویرانے کو دیکھا، جہاں ہر طرف بت شکنی
کے آثار تھے۔ یہ کشمیر کا سومنات ہے۔۔۔ زلزلوں کے آثار

اور سکندر بت شکن کا تعصب، سب نے اس پرستش گاہ کی عظمت
پر ضرب لگانے کی کوشش کی تھی مگر دروازے اور کہیں کہیں اونچی
دیوار اور نقش و نگار اب بھی اس کی پرانی شان و شوکت کی تصویر
آنکھوں میں زندہ کر رہے تھے۔"(۱۱۰)

ہندومت کے مذہب کی حکومت کے بعد "امر ناتھ" کے مذہب کا آغاز ہوا۔ کشمیر میں اس مذہب کی آمد نے یہاں کی قدرتی مناظر کی اہمیت کو اور بڑھا دیا تھا۔ موجود دور میں بھی ہر سال ہزاروں یوگی اور پجاری کشمیر کا رخ کرتے ہیں۔ امر ناتھ کے مقدس عبادات کی تاریخ چاند کے بڑھنے اور گھٹنے پر مختص ہیں کیونکہ اس کے مقدس ایام قمری مہینے کے مطابق طے کیے جاتے ہیں۔ اس لیے ہر سال یہ دن بدل بدل کے آتے رہتے ہیں۔ کشمیر میں ان یاتروں کے لیے خاص مقام بنائے گئے ہیں جہاں وہ دوران عبادت قیام کرتے ہیں۔

"برف پوش چوٹیوں اور کھلے کھلے دیوداروں میں گھرا ہوا ایک
چھوٹا سا میدان، جس میں کبوتروں کے کابکوں کے قسم کے کئی
چوبی جھونپڑے تھے جو امر ناتھ کے زائرین کے لیے بنائے گئے
تھے، کیونکہ یہیں سے پنج ترنی، شش رام ناگ اور دوا دیاں
ہوتے ہوئے ہر سال سینکڑوں، ہزاروں یوگی اور پجاری امر
ناتھ کے مندر کی زیارت کو جاتے ہیں۔"(۱۱۱)

ترنم ریاض نے ہندومت کے عروج کا وقت بیان کیا ہے جبکہ عزیز احمد نے ہندومت کے خاتمے کے وقت کو بیان کیا ہے۔ اور اس کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ کشمیر میں ہندومت کا مذہب بھی پایا جاتا ہے۔

ہندومت کے بعد ناگ کی پوجا کے مذہب کو کشمیر میں شروع ہوا۔ کشمیر کا دیومالائی پہاڑ منی کشیپ سے اس مذہب کا آغاز ہوا۔ اس مذہب کو شروع کرنے والا کشیپ رشی تھا۔ کشیپ رشی نے وشنو بھگوان پر حملہ کر کے باقی

دیو تاؤں کا کام تمام کیا۔ " پھر کشیپ منی کی اس وادی میں ناگوں اور دیوی دیو تاؤں نے زمینی خطوں اور جھیلوں کی شکل اختیار کر لی "(۱۱۲) کشمیر میں کافی عرصے تک ناگ کو پوجا جاتا رہا ہے۔

ترنم ریاض نے ناول " برف آشنا پرندے " میں ناگ کی پوجا کا ذکر کیا ہے جبکہ اس مذہب کا ذکر ناول " آگ " میں عزیز احمد نے نہیں کیا۔ عزیز احمد نے ہندومت کے اختیام پر مذہب اسلام کا ذکر کیا تھا۔

کشمیر میں مذہب اسلام کا آغاز گیارھویں صدی عیسوی میں ہوا ہے۔ اس سے پہلے کشمیر میں مختلف مذہب موجود تھے۔ گیارھویں صدی میں حضرت شاہ ہمدانؒ کے آنے کے بعد اسلام کشمیر میں پھیلا۔ وہ خاندان جنہوں نے اسلام قبول کیا انہیں نو مسلم شیخ کہا جاتا تھا۔

" شیخ خاندان وہ کہلائے تھے جو گیارھویں صدی میں حضرت

شاہ ہمدان کے ہندوستان آنے پر مشرف بہ اسلام ہوئے جن

کے ہمراہ کئی سید زادے بھی تھے اور ان کی درگاہیں وادی کے

مختلف علاقوں کے علاوہ سرینگر میں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ "(۱۱۳)

ترنم ریاض نے مذہب اسلام کے آغاز کا ذکر کیا ہے جو ۱۲ صدی میں ہوا ہے جبکہ عزیز احمد نے صرف صوفیاء اکرام کی بات کی ہے۔ حضرت بل اور سلطان زین العابدین جیسے صوفیاء نے اسلام کو کشمیر میں پھیلا ہے۔ " شالا مالا کے لالوں اور نسیم باغ کے سبزہ زار اور اچھابل کے حسن اور حضرت بل کی زیارت گاہ "(۱۱۴) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کشمیر میں بھی پورے برصغیر کی طرح صوفیاء اکرام کی درگاہ موجود ہیں جہاں مسلمان اپنی پوری عقیدت سے جاتے ہیں۔

مسلمانوں کی کشمیر میں آمد کے ساتھ ہی صوفیاء اکرام نے بھی کشمیر کا رخ کیا۔ ترنم ریاض نے دو صوفیا اکرام کا ذکر اپنے ناول " برف آشنا پرندے " میں کیا ہے۔ یہ صوفیاء اکرام نہ صرف لوگوں کو مذہب اسلام کی طرف بلاتے تھے بلکہ اس کے ساتھ اپنے کرامات سے بھی لوگوں کو متاثر کرتے تھے۔ غوث پاک سے روایت منسوب ہے کہ وہ قرآن کی کچھ آیات شکم مادر سے ہی یاد کر کے آئے تھے۔

" غوث پاکؒ حضرت میران صاحب سے روایت منسوب ہے کہ

شکم مادر میں تلاوت کلام پاک سننے سے انہیں آیا تازبر تھیں اور

سائنس نے یہ ثابت کر دیا کہ ماں نفسیات و حالات، ماحول، آوازیں،

صحت و تندرستی، مزاج اور آرام بلکہ ہر شے پیدا ہونے والے

بچے کی جسمانی اور ذہنی صحت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔"(۱۱۵)

ترنم ریاض اور عزیز احمد دونوں کے ہاں صوفیاء اکرام کا ذکر ملتا ہے۔ ترنم ریاض نے کشمیری ثقافت پر اثر انداز ہونے والے مذاہب کا مجموعی طور پر ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"قدیم ترین زبان و تہذیب کا مرکز کشمیر۔ رشیوں منیوں کا کشمیر،

شیخ العالم اور لل دید کا کشمیر، شاکھیہ منی کی پیشن گوئی کا بودھ گہوارہ

کشمیر، کشیپ رشی اور پرور سین کا کشمیر، للتا دیتہ کا اور سوئیہ کا

کشمیر، اشوک، کنشک، کلہن اور بڈھا شاہ کا کشمیر، حبہ خاتون کا کشمیر،

ارنی مال کا کشمیر۔"(۱۱۶)

ناول "آگ" میں ۱۹۰۸ء سے ۱۹۴۶ء کا دور بیان کیا گیا ہے۔ اس وقت انگریز پورے ہندوستان میں پھیل چکے تھے اور اپنی ثقافت کے اثرات بھی پورے برصغیر میں پھیلا چکے تھے۔ انہی اثرات کے تحت اب مسلمان صوفیاء اکرام کے درباروں سے دور ہو چکے تھے اس لیے عزیز احمد لکھتے ہیں:

"اب زمانہ بدل گیا تھا اور سلطان سکندر بت شکن یا سلطان زین

العابدین یا مہاراجہ رنجیت سنگھ کے قصے سنانے کی ضرورت باقی

نہیں رہی۔ جنگ نے شاید بہت لوگوں کو امیر بنا دیا ہے۔"(۱۱۷)

ترنم ریاض کے ہاں موجود دور میں پائے جانے والے مذہب اسلام اور ان کی نوعیت کے متعلق کوئی بات نہیں کی گئی ہے جبکہ عزیز احمد نے اس کی وضاحت کی ہے۔

توہمات پرستی کا تعلق مذہب سے ہوتا ہے۔ انسان جب سے دنیا میں آیا ہے وہ قدرت کے مظاہر کو دیکھ رہا ہے۔ قدرت انسان پر ہمیشہ ہی غائب رہی ہے۔ قدیم دور کا انسان جس کے پاس ٹیکنالوجی نہ ہونے کے برابر تھی۔ قدرت کے مظاہر سے زیادہ خوف زدہ ہوتا ہے۔ انسان کا کسی چیز کی پرتش کرنے کے دو ہی وجوہات رہی ہیں جو چیز انسان کو فائدہ پہنچتی تھی انسان اس کو پوجنا شروع کر دیتا تھا یا پھر جس چیز سے وہ خوف زدہ ہوتا اس سے خوف کی وجہ سے پناہ مانگتا تھا۔ آج بھی ہر علاقے کی ثقافت کے ساتھ کچھ توہمات وابستہ ہے جن کا وہاں کے لوگ نہ صرف خیال کرتے ہیں بلکہ سختی سے اس پر عمل پیرا بھی ہوتے ہیں۔

کشمیر کی ثقافت میں بھی کچھ توہمات ایسی ہیں جو نسل در نسل آج تک کشمیر میں چلی آرہی ہیں۔ جن میں سے ایک توہم "بیساکھی" کے دن بارش کا ہونا ہے۔ بیساکھی سکھ مذہب کا ایک تہوار ہیں جسے مسلمان، ہندو، سکھ الغرض برصغیر پاک وہند میں رہنے والا ہر انسان جو خواہ کسی بھی مذہب کا ہو اسے مناتا ہے۔ ہندو مذہب کے ماننے والوں کا عقیدہ ہے کہ بیساکھی پر بارش ضرور ہوتی ہے۔ عزیز احمد کے ہاں "بیساکھی" کے موقعے پر توہم پرستی پائی جاتی ہے کہ اس دن لازماً بارش ہوتی ہے:

"آج پنڈت لوگ کہتا ہے کہ بیساکھی کے دن کی وجہ سے بارش ہو گی۔ بے شک ہم مانتا ہے۔ بیساکھی کے دن بارش ضرور ہوتی ہے مگر ہم دین اسلام کا ہے جادو بر حق ہے۔ جادو کرنے والا کافر ہی جناب خواجہ صاحب۔"(۱۱۸)

بیساکھی چونکہ مذہبی دن ہوتا ہے اس لیے اس دن ہندو اور خاص طور پر پنڈت بڑی تعداد میں مندروں کا رخ کرتے ہیں۔ عزیز احمد نے ہمالیہ کے پہاڑوں کا ذکر کیا ہے جو کشمیر میں ہیں اور ہندو مت میں بڑے مقدس سمجھے جاتے ہیں۔ ہر سال لاکھوں کی تعداد میں لوگ ہمالیہ کے پہاڑوں کی طرف بیساکھی کے مہینے میں سفر کرتے ہیں۔

کشمیر کے لوگ "دیوان حافظ" کو مذہبی کتاب کا درجہ دیتے ہیں اور اس سے مستقبل کا حال دریافت کرتے ہیں۔ فال کے اچھے اور برے ہونے سے اپنے مستقبل کے اچھے اور برے ہونے کا اندازلگاتے ہیں۔ "باخدا حضرت بڑا منحوس

فال نکلا۔ کل سے میری بائیں آنکھ بھی پھڑک رہی ہے"[119] اس طرح کی توہمات عام طور پر دیہاتوں میں پائی جاتی ہیں۔ کسی بھی غیر معمولی چیز کو کسی خطرے کی گھنٹی سے یا خوشی سے خود ہی منسوب کر دیا جاتا ہے۔ عزیز احمد نے بتایا ہے کہ لوگوں کا دیوان حافظ پر اتنا پکا یقین ہے کہ جب فال کی تعبیر بری ہوتی تو وہ اس سے پریشان بھی نظر آتے تھے۔

"تو وہ مایوسی سے دیوان حافظ بند کر دیتا ہے اور امدو سے،
جو دن بدن اس پر ترس کھا کھا کے اس کا "راز داں" اور
سب بڑا دوست بن گیا تھا کہتا کہ "امدو تو کوئی راستہ نکال"
نہیں تو میں اپنی جان دے دوں گا۔"[120]

برصغیر کے علاقے میں مذہب کے نام پر ایسے ایسے عقائد بنائے گئے ہیں، جن کا اصل مذہب سے کوئی تعلق ہی نہیں پایا جاتا۔ ترنم ریاض توہم پرستی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ کشمیر کے راجہ "راجہ گلاب" کے بارے میں ایک توہم پرستی پائی جاتی ہے کہ راجہ کی وفات کے بعد ان کی روح مچھلی میں چلی گئی تھی۔

"پہلے ڈوگرہ راجہ گلاب سنگھ کے انتقال پر پروہتوں نے بتایا کہ
ان کی روح مچھلی میں داخل ہوئی ہے۔ ان کی روح کی بے
حرمتی نہ ہو اس لئے ان کے جانشین مہاراجہ نے چھ برس تک
مچھلی کے شکار پر پابندی عائد کر دی۔"[121]

یہاں تک یہ مچھلی کے شکار پر اس وقت تک پابندی عائد رہی جب تک علاقے میں غذا کی کمی نہ ہو گئی۔ قحط کے دنوں میں بھوک سے تنگ آکر مچھلی کے شکار کی اجازت دی گئی لیکن فوراً ہی حکم واپس لے لیا گیا کہ اس بات سے راجہ کے روح کو تکلیف ہو گئی۔

توہمات کی حیثیت مقامی ہوتی ہے۔ ہر علاقے میں توہمات مختلف ہوتی ہے۔ یہاں تک کے ایک ہی توہم کا دوسرے علاقے میں مطلب مختلف ہو جاتا ہے۔ یہ علامتیں استعارے کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔

"ممکن ہے یہ چیزیں کسی مثبت اشارے کی حامل ہوا کرتی ہوں۔

شبیا نے مثال دی تھی کہ جیسے ہمارے یہاں اُلوّاور گدھا، اُلو اور

گدھا ہی ہوتا ہے جبکہ بعض مقامات پر ان دونوں کو عقل مند

گردانا جاتا ہے۔"(۱۲۲)

دونوں ناول نگاروں نے کشمیری ثقافت میں موجود توہمات کی بات کی ہے۔ لیکن دونوں کی توہمات ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ عزیز احمد نے "بیساکھی" اور " دیوان حافظ " سے متعلق پائی جانے والی توہمات کو موضوع بحث لایا ہے جبکہ ترنم ریاض نے "راجہ صاحب کی روح مچھلی میں ہے " کی توہم پرستی کو بیان کیا ہے۔

کسی خطے کی روایات اس خطے کی تاریخ سے جڑی ہوتی ہیں۔ اساطیر بنیادی طور پر " سطر " سے نکالا ہے۔ اساطیر انگریزی زبان کے لفظ "میتھ " سے نکلا ہے۔ اسطورہ کی تعریف مختلف لغات میں مختلف انداز میں کی گئی ہے۔ اساطیر سے مراد وہ قصے کہانیاں ہیں جو روحانی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان قصوں میں مافوق الفطرت عناصر، جن، بھوت،، مذہبی خرافات شامل ہیں۔ اس میں ایسی کہانی بنائی جاتی ہے جس کا تعلق کسی نہ کسی مذہبی یا روحانی شخصیت سے ہوتا ہے۔ تاکہ علاقے کے لوگوں پر اس شخصیت کے واضح اثرات مرتب ہوتے دیکھے جا سکیں

"اسطورہ یا میتھ یونانی زبان کے لفظ مائی تھوس سے ماخوذ ہے جس

کا لغوی مفہوم ہے وہ بات جو زبان سے ادا کی گئی ہو۔ یونہی کوئی

قصہ یا کہانی ابتدا اسطور کا یہی تصور رائج تھا۔ یوں کہ اسطور اس

کہانی کا نام پایا دیوتاؤں کے کارناموں سے متعلق تھی یا ان

شخصیتوں کی مہمات کو بیان کرتی تھی جو زمین پر دیوتاؤں کی

نمائندگی تھیں۔"(۱۲۳)

اساطیر کا تعلق مذہب کے ساتھ ساتھ علاقے سے ہوتا ہے۔ علاقائی جغرافیہ اور اس سے متعلق خدوخال مافوق الفطرت عناصر کو جنم دیتے ہیں جس پر لوگ بعد میں یقین کر لیتے ہیں۔ عزیز احمد نے " آگ " میں کشمیری اساطیر کو بیان

کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کشمیر میں ایک وادی "ستی سا" موجود ہے۔ اس علاقے میں مختلف اقسام کی اسطورہ پائی جاتی ہیں کہ وہ علاقہ دو خداؤں کے جھگڑے کی وجہ سے میدان بنا ہے۔ سالوں کی تحقیق یہ بات ثابت کی ہے کہ اس علاقے میں ایک عرصے تک لمبی جھیل موجود تھی بعد میں یہ علاقہ زمین کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

"ایک یوگی تھا جس کا نام کاشیپ تھا۔ اس نے اس جھیل کو خالی
کر دیا۔ اس نے رام پور کے پاس کی چٹانیں ہٹا کے جہلم کو اوڑی،
دو میل، کوہالہ، جہلم، پنجاب کی طرف بہا دیا۔ اور یہ وادی
میدان بن کے نکل آئی۔ جہلم بھی جھیل کے بجائے سوکھ کے
ایک ندی رہ گئی۔ اس کاشیپ کے نام پر اس سرزمین کو لوگ کا
سیپ پور یا کاشیپ مار کہنے لگے اور یہ کاشیپ مار گھٹ کے کاشمیر
ہو گیا۔"(۱۲۴)

اسی علاقے کے ساتھ سے ایک راستے مانس بل اور دلر جھیل کو جاتا ہے جو کشمیر میں پرانی جھیل کے نام سے منسوب ہے۔ اس جگہ کو ستی سار مرحوم کی باقیات الصالحات بھی کہا جاتا ہے۔ ترنم ریاض نے اسی جھیل کا ذکر کیا ہے جس کی بنیاد کشیپ رشی نے رکھی تھی۔ ناگ پوجا کے مذہب کے بانی "کشیپ رشی" تھے جنہوں نے باقی دیوتاؤں سے جنگ کر کے ان کا خاتمہ کیا۔ اس کے بعد کئی جھلیں کشمیر میں وجود میں آئی جن میں سے ایک "دلر" تھی۔ اس جنگ کے دوران وہ خشک ہو گئی تھی۔

"جب ولر کا نام مہاپدم جھیل رکھا گیا تھا اور ڈل کو ہستو الیکا کا پکارا
جاتا تھا مگر ڈل جھیل کئی ہا برس تک ریگستان تھی اور اس کا نام
تالن مرگ تھا۔ بعد کو جھیل بننے پر بہت دیر تک تالاب مرگ
کہلاتی رہی تھی یہ جھیل۔ اور عزیز از جان اس کے شہر سرینگر کا

قدیم پرور پورہ تھا یعنی راجہ رپور سین کا بسایا ہوا نگر۔"(۱۲۵)

عزیز احمد اور ترنم ریاض دونوں نے جھیل ڈل کی بات کی ہے۔ دونوں نے اس اساطیر کے متعلق الگ الگ کہانی بیان کی ہے۔ البتہ دونوں ناولوں میں اساطیر کا مرکزی کردار "کشیپ رشی" ہی ہے۔ ترنم ریاض کے مطابق کشیپ رشی نے جنگ کی جس کے نتیجے میں یہ جھیل واقع ہوئی جبکہ عزیز احمد کے مطابق یہ جھیل واقع تھی لیکن خداؤں کے جھگڑے کے نتیجے میں یہ جھیل خشک ہو کر میدان کی صورت اختیار کر گی جسے بعد میں کشیپ شی نے پتھر ہٹا کر یہ جھیل بنائی تھی۔

ترنم ریاض کشمیر میں پائے جانے اساطیر کے بارے میں ذکر کرتی اپنے ناول میں کرتی ہیں۔ کشمیر میں "ناگ رائے" کی کہانی بطور اساطیر استعمال کی جاتی ہے۔ اس اساطیر کے مطابق جو سانپ سو سال کا ہو جائے تو قدرت کی طرف سے اسے ایک خاص صلاحیت سے نوازا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ انسان کا روپ اختیار کر سکتا ہے۔ کشمیر کے لوگوں کے مطابق یہ ناگ رائے "تاپال" میں رہتا ہے۔ "اور وہ بھی جھیل کے نیچے کہیں بہت اندر۔ اس نے پانی سے باہر نکلتے ہی بھیس بدلا اور ایک حسین نوجوان کی شکل اختیار کر لی۔"(۱۲۶) اس کہانی میں شہزادی کا کردار "ہیمال" نامی ایک لڑکی کا ہے جو وہاں کے بادشاہ کی بیٹی ہے۔ بادشاہ ناگ رائے کو پسند نہیں کرتا تھا۔ ابھی تک ناگ رائے راجہ بھی نہیں بنا تھا۔

"وہ گہرے پانیوں کے راستے باہر نکل کر اس دنیا میں آجاتا ہے۔
ادھر بادشاہ اپنی شہزادی کے لئے کسی اچھے دولہے کی تلاش میں
تھا کہ شاہزادی کسی سے شادی کرنے پر راضی نہیں ہوتی تھی۔
جب شہزادی ناگ رائے سے مل کر خوش نظر آئی تو بادشاہ ناگ
رائے کی رہائش کا انتظام شاہی محل کے خاص مہمان خانے میں
کرواتا ہے۔ یہ ناگ رائے اور شہزادی کی دوستی ہو جاتی ہے۔"(۱۲۷)

کشمیر میں جب سے ناگ کی پوجا کا مذہب شروع ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی مذہبی اساطیر کا وجود بھی قائم ہو گیا تھا۔ چونکہ یہ مذہب کشمیر کی تاریخ میں موجود ہے اس لیے آج بھی اس اساطیر کو مذہبی حیثیت حاصل ہے

اور لوگ اس کو من و عن قبول کرتے ہیں۔ اساطیر ہر علاقے کی ثقافت کا حصہ رہی ہیں۔ تاہم بدلتے حالات اور جدید ٹیکنالوجی نے کسی حد تک اساطیر کو کم دیا ہے۔ لیکن اب تک اساطیر کے اثرات ثقافت میں موجود ہیں اور لوگ اسے مانتے ہیں اور اس کے مطابق اپنی زندگی بھی گزرتے ہیں۔

حوالہ جات

۱. شمیم حنفی، ڈاکٹر، اردو کا تہذیبی تناظر اور معاصر تہذیبی صورت حال، شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص:۱۰

۲. مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، ثقافتی بشریات، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء، ص:۱۸۸

۳. ایضاً، ص:۱۸۹

۴. ایضاً، ص:۱۹۱

۵. سید عبد اللہ، ڈاکٹر، کلچر کا مسئلہ، علمی پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص:۱۶

۶. وزیر آغا، معنی اور تناظر، انٹر نیشنل اردو پبلیکیشنز، دہلی، ۲۰۰۰ء، ص:۴۳

۷. طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء ص:۵۹۲

۸. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، بک کارپوریشن، دھلی، ۲۰۰۹ء ص:۲۹۴

۹. ایضاً، ص:۳۷۱

۱۰. ایضاً، ص:۵۲۳

۱۱. طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص:۵۳۱،

۱۲. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۲۶۶

۱۳. طاہر منصور فاروقی، عزیز احمد کے چار ناول، ص:۴۲۱، ۴۲۰

۱۴. ایضاً، ص:۴۰۱

۱۵. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۱۳۸

۱۶. ایضاً، ص: ۲۴۳

۱۷. عائشہ بیگم، تاریخ اور سماجیات، ترقی اردو بیورو نئی دہلی، ۱۹۸۷ء، ص:۱۲

۱۸. فیض احمد فیض، ہماری قومی زبان، ادارہ یادگار غالب، کراچی، ۱۹۷۶ء، ص:۲۳

۱۹. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۲۲

۲۰. طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، ص: ۳۹۴

۲۱. ایضاً، ص: ۳۹۴

۲۲. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص: ۱۳۱

۲۳. طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، ص: ۵۵۵

۲۴. ترنم ریاض: برف آشنا پرندے، ص: ۴۲۰

۲۵. ایضاً، ص: ۵۲۲

۲۶. طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، ص: ۳۹۷

۲۷. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص: ۲۵۹

۲۸. طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، ص۴۷۷

۲۹. ایضاً، ص: ۵۶۶

۳۰. ایضاً، ۶۰۴

۳۱. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص: ۲۶۴

۳۲. ایضاً، ۲۷۲

۳۳. ایضاً، ص: ۲۵۷

۳۴. سلیم اختر، ڈاکٹر، ادب اور کلچر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱، ص: ۲۱۰

۳۵. عبد السلام خورشید، ڈاکٹر، "پاکستانی ثقافت"، مشمولہ: پاکستانی ثقافت، پاکستانی ادیبوں کے منتخب مضامین، مرتبہ: ڈاکٹر رشید امجد، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۱۹۹۹ء، ص: ۱۲۴

۳۶. شکیل احمد خواجہ، مسئلہ کشمیر ایک تاریخی جائزہ، لاہور، کلیہ علوم اسلامیہ و شرقیہ پنجاب ،یونیورسٹی، ۱۹۹۹ء، ص: ۱۵

۳۷. وزیر آغا، کلچر کے خدوخال، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص: ۹۵

۳۸. طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، ص: ۴۶۶

۳۹. ایضاً، ص: ۴۹۶

۴۰. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۲٦۳

۴۱. ایضاً، ص:۲۱۵

۴۲. بلوچ، ڈاکٹر، "پاکستانی ثقافت کے مسائل"، مشمولہ: ادب کلچر اور مسائل، مرتب: خاور جمیل، رائل بک کمپنی، کراچی، ۱۹۸٦ء، ص:۳۲۷

۴۳. طاہر منصور فاروقی، عزیز احمد کے چار ناول، ص:۴۰۵، ۴۰۴

۴۴. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۳۷

۴۵. ایضاً، ص:۳۷

۴٦. ایضاً، ص:۲۴

۴۷. ایضاً، ص:۳۷

۴۸. طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، ص:۴۱۰

۴۹. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۳۴

۵۰. طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، ص:۵۰۲

۵۱. ایضاً، ص:۴۰۸

۵۲. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۲۴

۵۳. مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، ثقافتی بشریات، ص:۲۴۴

۵۴. طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، ص:۴۹۷

۵۵. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۴۱۱

۵٦. طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، ص:۴۰۱

۵۷. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۱۸۳

۵۸. ایضاً، ص:۱۴۸

۵۹. عفیفہ، ڈاکٹر، اردو ادب اور دہلی کی مشترکہ تہذیب، ایم۔ آر پبلیکیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱٦ء، ص:۱۸

٦۰. طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، ص:۴۲۰

۶۱. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۲۱۰

۶۲. ایضاً، ص:۲۱۱

۶۳. ایضاً، ص:۲۱۱

۶۴. طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، ص:۴۲۱

۶۵. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۵۸

۶۶. مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، ثقافتی بشریات، ص:۳۶۳، ۳۶۲

۶۷. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۴۷۸

۶۸. ایضاً، ص:۲۸۳،

۶۹. ایضاً، ص:۲۱۰

۷۰. طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، ص:۴۳۳

۷۱. ایضاً، ص:۴۳۵

۷۲. عطرت بتول، معاصر اردو افسانے میں ثقافتی مغائرت کی عکاسی، حرف و سخن، ص:۳۸

۷۳. طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، ص:۴۱۶

۷۴. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۱۴۲

۷۵. طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، ص:۴۳۰

۷۶. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۴۶۲

۷۷. طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، ص:۴۰۴

۷۸. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۲۶۰

۷۹. ایضاً، ص:۳۵۷

۸۰. ایضاً، ص:۵۳

۸۱. طاہر منصور فاروقی، عزیز احمد کے چار ناول، ص:۵۳۶

۸۲. ایضاً، ص:۴۶۱

۸۳. ترنم ریاض،برف آشنا پرندے،ص:۲٦

۸۴. ایضاً،ص:۴۹۸

۸۵. خلیفہ عبدالحکیم ،ڈاکٹر، مضمون:" ثقافت"،مشمولہ:کلچر منتخب تنقیدی مضامین،اشتاق احمد،بیت الحکمت ،لاہور،۲۰۲۳ء،ص:۳۷،

۸٦. ترنم ریاض،برف آشنا پرندے،ص:۲۰

۸۷. طاہر منصور فاروقی،مرتب:عزیز احمد کے چار ناول،ص:۴۲۲

۸۸. ایضاً،ص:۴۴۵

۸۹. ترنم ریاض،برف آشنا پرندے،ص:۵٦

۹۰. طاہر منصور فاروقی،مرتب:عزیز احمد کے چار ناول،ص:۴۰۴،

۹۱. ترنم ریاض،برف آشنا پرندے،ص۴۹۳

۹۲. طاہر منصور فاروقی،مرتب:عزیز احمد کے چار ناول،ص:۴۹۸

۹۳. ترنم ریاض،برف آشنا پرندے،ص:۹۷،۹٦

۹۴. طاہر منصور فاروقی،مرتب:عزیز احمد کے چار ناول،ص:۵۸۵

۹۵. ترنم ریاض،برف آشنا پرندے،ص:۵۰۳

۹٦. طاہر منصور فاروقی،مرتب:عزیز احمد کے چار ناول،ص:۴۲۰

۹۷. ایضاً،ص:۴۲۰

۹۸. ایضاً،ص:۵۳۲

۹۹. ترنم ریاض،برف آشنا پرندے،ص:۴۳۷

۱۰۰. طاہر منصور فاروقی،مرتب:عزیز احمد کے چار ناول،ص:۴۱۷

۱۰۱. ایضاً،ص:۵۰۰

۱۰۲. ایضاً،ص:۴۱۰

۱۰۳. جمیل جالبی،ڈاکٹر،پاکستانی کلچر،مشتاق بک ڈپو،کراچی،۱۹٦۴ء،ص:۱۵۱

۱۰۴. وزیر آغا، کلچر کے خدوخال، ص:۳۰
۱۰۵. مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، ثقافتی بشریات، ص:۴۹
۱۰۶. طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، ص:۳۹۶
۱۰۷. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۲۳
۱۰۸. طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، ص:۳۹۷
۱۰۹. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۱۳۱
۱۱۰. طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، ص:۵۵۵
۱۱۱. ایضاً، ص:۵۵۸
۱۱۲. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۲۹۳
۱۱۳. ایضاً، ص:۶۱
۱۱۴. طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، ص:۴۳۳
۱۱۵. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۲۳۶
۱۱۶. ایضاً، ص:۶۲
۱۱۷. طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، ص:۴۳۷
۱۱۸. ایضاً، ص:۴۲۳
۱۱۹. ایضاً، ص:۴۸۳
۱۲۰. ایضاً، ص:۴۵۵
۱۲۱. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۲۶۲
۱۲۲. ایضاً، ص:۴۱۹
۱۲۳. وزیر آغا، تخلیقی عمل، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، ۱۹۷۰ء، ص:۵۱
۱۲۴. طاہر منصور فاروقی، عزیز احمد کے چار ناول، ص:۴۹۷
۱۲۵. ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص:۲۹۳

۱۲۶.　ایضاً، ص:۱۹۶

۱۲۷.　ایضاً، ص:۱۹۸

باب چہارم:

مجموعی جائزہ

مجموعی جائزہ:

اس مقالے "ادب اور ثقافت: منتخب اردو ناولوں میں کشمیری ثقافت کے مظاہر میں تنوع کا تجزیہ" میں اردو ناولون میں کشمیر کے ثقافتی پہلو کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے ڈاکٹر مظفر حسن ملک کی کتاب "ثقافتی بشریات" سے "ثقافتی تنوع" کی تھیوری کو اخذ کیا گیا ہے۔ جس کی بنیاد پر اردو ناول میں ثقافتی تنوع کا جائزہ لیا گیا ہے جس کے ذریعے بالخصوص کشمیری ثقافت کے تنوع کو دیکھا گیا ہے۔ ثقافت اور ثقافتی تنوع کے موضوع کو پہلے باب "موضوع تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث" میں تفصیلاً بیان کیا گیا ہے جس میں ثقافت کے مظاہر مثلاً مذہب، رہن سہن کے طریقے، زبان، کھانے، رسومات اور فطری مظاہر کو زیر بحث لایا گیا۔ ثقافتی مظاہر اور اس میں تنوع کی وجوہات کو مختصراً بیان کیا گیا ہے۔

ثقافت زندگی کے تمام پہلوؤں پر مشتمل ایسا نظام ہے جس میں پیدائش سے لے کر موت تک کے تمام پہلو شامل ہوتے ہیں۔ ثقافت کے تحت ہر انسان کی طرزِ زندگی ایک جیسی ہوتی ہے۔ ثقافت سے مراد کسی بھی معاشرے کے رہن سہن کے طریقے، زبان، ذہنی میلانات اور رجحانات ہیں۔ ثقافت کی بناوٹ میں سب سے اہم کردار معاشرے کے مقاصد اور نصب العین ادا کرتے ہیں۔ معاشرے کے نصب العین میں تبدیلی کے ساتھ ثقافت میں بھی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔

ہر نسل اپنی آنے والی نسل تک ثقافت منتقل کرتی ہے۔ ایک مہذب معاشرہ اپنی آنے والی نسل کو ثقافت سیکھتا ہے۔ جو معاشرہ پیار و محبت اور خلوص سے رہتا ہے اس میں ثقافت زندہ رہتی ہے جبکہ جو معاشرہ اختلافات کے باعث ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہتا ہے وہاں کی ثقافت جمود کا شکار ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہاں کی ثقافت، ثقافت کی بجائے عادات بن کر رہ جاتی ہیں، جن میں تبدیلی لانا وہاں کے لوگوں کے نظریے کے مطابق ناممکن ہے۔ ایسی صورت میں یہ

ثقافت چند سالوں میں نام ونشان ختم ہونے کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔لوگ ماضی کے تجربات سے سبق حاصل کرتے ہیں۔اور اس بنیاد پر نئے تجربات کرتے ہیں۔ثقافت ایک اکتسابی عمل ہے۔جو معاشرے سے سیکھتا ہے۔

ثقافت کے کچھ تشکیلی عناصر ہوتے ہیں جو مل کر ثقافت کو تشکیل دیتے ہیں۔ان عناصر میں تاریخ،لباس،زبان، کھانے،لوک ورثہ،رسومات،مذہب،توہمات اور اساطیر شامل ہیں ۔مذہب ثقافت پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے کیونکہ انسان کے مذہبی اعتقادات معاشرے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ثقافت ماحول اور جغرافیے سے تشکیل پاتی ہے۔رسومات، کھانے اور بودوباش کسی بھی علاقے کی خاص پہچان ہوتے ہیں۔یہ وہ عوامل ہیں جو ایک ثقافت کو دوسری ثقافت سے ممتاز اور منفرد بناتے ہیں۔

وقت کی تبدیلی کے ساتھ ثقافت میں تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے۔ثقافت میں تنوع آنا ایک فطری عمل ہے۔ ثقافت میں تبدیلی کے کئی وجوہات ہیں جن میں کچھ مادی وجوہات ہیں اور کچھ فطرتی وجوہات ہوتی ہیں۔ثقافت میں تبدیلی لانے کے لیے صدیوں کا عرصہ درکار ہوتا ہے کیونکہ معاشرے کے اندر رہتے ہوئے فرد اس ثقافت کو قبول کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ آسانی سے اس میں تبدیلی نہیں لا سکتا۔ثقافت میں تبدیلی لانا مشکل عمل ضرور ہے پر یہ ناممکن عمل نہیں۔

ثقافت میں تنوع کی رفتار کا تعین کرنا مشکل عمل ہے۔بعض اوقات کسی چیز کو قبول کرنے میں معاشرہ کو کم وقت درکار ہوتا ہے جبکہ بعض اوقات کسی عمل کو قبول کرنے میں کافی وقت لگ جاتا ہے۔اس لیے ہر معاشرے میں ثقافتی تنوع کی رفتار مختلف ہوتی ہے۔ثقافت میں تنوع کا رخ متعین خود بخود ثقافتی عناصر کرتے ہیں۔لیکن جو ثقافتیں جمود کا شکار ہوتی ہیں،ان کے لیے معاشرے کو خود جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ایسی صورت میں معاشرہ جن ثقافتی اطوار کو اپنانا چاہتا ہے اسے زیادہ سے زیادہ تقویت دی جاتی ہے۔تاکہ وہ ترقی پا کر معاشرے میں قبولیت عام کی سند حاصل کر سکیں۔

ثقافت تنوع کی بڑی وجہ جدید ٹیکنالوجی کا استعمال ہے۔اکیسوی صدی میں ٹیکنالوجی کا حد سے بڑھتا رحجان ہر معاشرے کی ثقافت میں تبدیلی کا سبب بن رہا ہے۔ثقافتی تنوع کی بڑی وجہ وہاں کے لوگوں کا تبدیلی کو قبول کرنا ہے ۔جب معاشرہ کسی نئی چیز کو قبول کرتا ہے تو وہ ثقافتی تنوع کا سبب بنتی ہے۔

ادب اور ثقافت کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ ادب چونکہ معاشر کا عکاس ہوتا ہے اور معاشرہ ثقافت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس لیے ثقافت میں تنوع کے اثرات ادب میں بھی نظر آتے ہیں۔ ادیب جو معاشرے کا سب سے حساس فرد مانا جاتا ہے، ان اثرات کو ادب کا حصہ بناتا ہے۔ کشمیر کو دنیا میں منفرد مقام حاصل ہے۔ کشمیر اپنی قدرتی خوبصورتی کی وجہ سے ہر سال لاکھوں سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنتا ہے۔ کشمیر کو جغرافیائی لحاظ سے بھی نہایت اہمیت حاصل ہے۔ ۱۹۴۸ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد آدھا کشمیر پاکستان کے حصے میں آیا اور آدھے حصے پر بھارت قابض ہے۔ دیگر ثقافتوں کی طرح ادباء نے کشمیری ثقافت کو بھی ادب کا حصہ بنایا ہے۔ اس مقالے میں کشمیری ثقافت کے مظاہر میں تنوع کی عکاسی کے لیے دو ناولوں کو منتخب کیا گیا ہے جس میں ایک ناول "آگ" عزیز احمد کا جبکہ دوسرا ناول ترنم ریاض کا "برف آشنا پرندے" ہے۔ ان ناولوں کی اشاعت میں تقریباً ۶۰ سال کا موجود ہے۔ دونوں ناولوں میں کشمیری ثقافت موجود ہے۔ ناول "آگ" میں بیسوی صدی کی ثقافت کو بیان کیا گیا ہے جبکہ ناول "برف آشنا پرندے" میں بیسوی صدی کے ساتھ اکیسوی صدی کی ثقافت کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔ عزیز احمد اور ترنم ریاض دونوں کا تعلق کشمیر سے ہے۔ عزیز احمد نے اپنا بچپن کشمیر میں گزرا ہے جس کی وجہ سے کشمیر کی ثقافت کو بخوبی دیکھا ہوا ہے جبکہ ترنم ریاض کا تعلق ایک کشمیری خاندان سے ہے۔ ترنم ریاض نے بھی اپنا بچپن کشمیر میں گزرا ہے جس کی وجہ سے انھوں نے کشمیری ثقافت اور اس میں ہونے والے تنوعات کا بذات خود جائزہ لیا ہے۔

کسی بھی علاقے کی ثقافت پر سب سے پہلے اثر انداز ہونے والا عوامل میں فطرت ہے۔ فطرت کے مظاہر ثقافت کے نصب العین کو طے کرتا ہے۔ عزیز احمد اور ترنم ریاض دونوں نے کشمیر کے فطری مظاہر کو تفصیلاً بیان کیا ہے۔ دونوں ناولوں میں فطرت کے مختلف مظاہر کو بیان کیا گیا ہے۔ کشمیر کی خوبصورتی کی بڑی وجہ وہاں کے پہاڑ ہیں جو کشمیر کو پوری دنیا میں منفرد بناتے ہیں۔ کشمیر کی جھلیں اس کی خوبصورتی میں مزید اضافے کا باعث ہیں۔ "چنار" کا درخت وہاں کی ثقافت کی علامت ہیں۔ دونوں ناولوں میں "چنار" کے ساتھ ساتھ چیڑ، دیوار، صنوبر، مجنون، زعفران کے علاوہ سرسوں، خوبانی اور آلو بخارے کی کاشت کی بات کی گی ہے۔ فطرت کی خوبصورتی کی بات کرتے ہوئے ناول نگاروں نے بہار اور خزاں کے موسم کی عکاسی کی ہے۔ کشمیر کی خوبصورتی کی ایک وجہ وہاں کی برف باری ہے جو قدرتی مناظر کو مزید خوبصورت بناتی ہے۔ ترنم ریاض نے برف باری کی بات کرتے ہوئے اسے "مچھروں" سے تشبیہ دی ہے۔ ترنم ریاض لکھتی ہیں کہ برف باری کے مناظر ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے مچھر پہاڑوں سے گر رہے ہوتے ہیں۔

تاریخ اور ثقافت ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ تاریخ کے ذریعے ثقافت پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا پتہ چلتا ہے۔ کسی بھی معاشرے کی ثقافت کو جاننے اور اس کے نصب العین کو سمجھنے کا واحد ذریعہ تاریخ ہے۔ ترنم ریاض اور عزیز احمد دونوں نے کشمیر کی تاریخ کو ناول کا حصہ بنایا ہے۔ "آگ" اور "برف آشنا پرندے" میں تاریخ کا آغاز بدھ مت سے کیا گیا ہے۔ ترنم ریاض نے یہ بدھ مت کی تاریخ پانچ ہزار قبل مسیح بتائی ہے جبکہ عزیز احمد کے ہاں تاریخ معین نہیں کی گئی ہے۔ بدھ مت کے بعد ہندومت کے اثرات کشمیری ثقافت میں نظر آتے ہیں۔ بدھ مت کے اثرات کے بارے میں عزیز احمد نے ان مقامات کی نشاندہی کی ہے جہاں آج بھی وہ آثار پائے جاتے ہیں۔ ہندومت کے بعد ترنم ریاض نے ناگ دیو کے مذہب کا ذکر کیا ہے جبکہ "آگ" میں اس مذہب کا ذکر موجود نہیں ہے البتہ واقعات کے تسلسل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ناگ دیو کا مذہب کشمیر میں رہا ہے۔ ناول "برف آشنا پرندے" کے مطابق ۱۲ صدی جبکہ "آگ" کے مطابق ۱۳ صدی میں مسلم کشمیر میں داخل ہوئے جس کے ساتھ ہی ہندوستان میں مذہب اسلام کا پھیلاؤ شروع ہو گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ کے ساتھ مسلم حکومت کا خاتمہ ہوا اور انگریزوں نے اپنی حکومت قائم کی ہے۔ عزیز احمد کے ہاں بیسوی صدی کے واقعات کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے جس میں جنگ بلقان، پہلی جنگ عظیم، شملہ کانفرس شامل ہے جبکہ ترنم ریاض کے ہاں ۱۹۴۷ء کے واقعات کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد کشمیر کے حالات کو ترنم ریاض نے ناول کا حصہ بنایا۔ اکیسوی صدی کے اثرات بھی ناول میں نظر آتے ہیں۔ دونوں ناولوں میں اشاعت میں فرق کی وجہ سے تاریخ کی عکاسی میں بھی فرق ہے ایک قیام پاکستان سے پہلے تک کا عکاس ہے جبکہ دوسرا اکیسوی صدی تک کی عکاسی کرتا ہے۔

جغرافیائی صورت حال ثقافت کی بناوٹ میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جغرافیائی عناصر ثقافت کے بیرونی خدوخال کو طے کرتے ہیں۔ کشمیر اپنے جغرافیے کی وجہ سے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ کشمیر میں دنیا کے تین بڑی پہاڑی سلسلے موجود ہیں جو بعض اقوام کے نزدیک مذہبی حیثیت رکھتے ہیں۔ کشمیر کے جغرافیائی خدوخال میں تبدیلی کی وجہ سے کشمیری ثقافت میں بھی تنوع آ گیا ہے۔ عزیز احمد نے کشمیر کے جغرافیہ کو بیان کرتے ہوئے اسے راولپنڈی تک پھیلا دیا ہے جس میں پنجاب کے بھی کچھ علاقے شامل ہیں۔ جبکہ ۱۹۴۸ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد کشمیری جغرافیے میں تبدیلی آ گئی ہے۔ کشمیر کا آدھا حصہ پاکستان میں شامل ہیں جبکہ آدھے حصے پر بھارت قابض ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں

بھارت کی ثقافت کے اثرات نظر آتے ہیں۔ ہر قابض قوم اپنے اثرات محکوم قوم پر ڈالتی ہے۔ جس کی عکاسی ترنم ریاض نے کی ہے۔ عزیز احمد کے ناول "آگ" میں صرف انگریز قوم کے ثقافت پر اثرات کو ہی بیان کیا گیا ہے۔

فرد تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ جب مختلف افراد مل کر ایک ساتھ زندگی گزرتے ہیں تو کچھ اصول وضوابط طے کیے جاتے ہیں جو معاشرے میں امن وسکون قائم کرنے میں مدد گار ثابت ہوتے ہیں۔ انہیں اصول وضوابط کو بودوباش کہا جاتا ہے۔ کشمیر کی بودوباش کو بیان کرتے ہوئے ترنم ریاض نے کشمیری ثقافت پر اثرانداز ہونے والے بدھ مت کی بات کی ہے جس کی طرز پر کشمیر میں مکانات کی تعمیر کی جاتی تھی، وقت کی تبدیلی کے ساتھ کشمیر میں مسلم حکمرانوں اور بعد میں وکٹوریہ حکومت قائم ہونے کی وجہ سے طرز معاشرے میں ان کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ عزیز احمد نے وہاں کے طرز معاشرت کی بات کرتے ہوئے مسلم طرز تعمیر کی عکاسی کی ہے۔ جبکہ انگریزوں کی آمد کے بعد کشمیر کے ہاں انگریزوں کی طرح سہ منزلہ مکانات کی تعمیر بھی شروع ہو گئی تھی۔

مسلمان برصغیر میں ہزاروں سال پہلے کشمیر کے راستے ہی داخل ہوئے تھے۔ کشمیر میں قیام کے دوران انہوں نے کشمیری ثقافت کو متاثر کیا جس کے اثرات کشمیری فنون لطیفہ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ کشمیری فنون لطیفہ میں گھروں کی نمائش کے لیے مصوری کی جاتی ہے جس میں چناروں کے پتوں کے علاوہ علاقائی جانوروں کی تصویروں کو بنایا جاتا ہے۔ کشمیر میں گھروں کی سجاوٹ کے لیے "حنوط" کا طریقہ استعمال کیا جاتا ہے جس کے ذریعے جانوروں کی گردن کو محفوظ کیا جاتا ہے۔

کشمیر میں انگریزوں کی ثقافت کا اثرات نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ مقامی ثقافتی چیزوں کے علاوہ لوگ مختلف طرح کی بندوقوں کو بھی گھروں کی سجاوٹ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کشمیر کے قالین پوری دنیا میں اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ بیسوی صدی تک کشمیری قالین کی مانگ پوری دنیا میں پائی جاتی تھی جو کشمیری ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں۔ عزیز احمد نے ناول "آگ" میں پوری قالین بافی کی تاریخ کو بیان کیا ہے۔ موجود دور میں ہاتھ سے بنائے جانے والے قالین کی صنعت کم نظر آتی ہے۔ آج بھی کشمیر میں قالین بافی کی صنعت کہیں کہیں نظر آتی ہے جن میں زیادہ تر قالین مشینوں سے بنائے جاتے ہیں۔ میکانی قالین اور ہاتھ سے بنے قالین دونوں میں کشمیری ثقافت کی عکاسی میں فرق پایا جاتا ہے جو ثقافتی تنوع کی بڑی وجہ ہے۔

زبان انسانی جذبات و نظریات کی فراہمی کا ذریعہ ہے۔ زبان ثقافت کی فراہمی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ کسی دوسرے علاقے کے لوگوں تک ثقافت کی رونمائی کا ذریعہ زبان ہے۔ ہر علاقے کی زبان دوسرے علاقے کی زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ زبان بیرونی اثرات قبول کرتی ہے۔ اگر کوئی زبان بیرونی اثرات قبول نہ کرے تو جلد ہی وہ زبان محدود ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس لیے ہر زبان دوسری زبان سے اثر قبول کرتی ہے۔ برصغیر کی دوسری زبانوں کی طرح کشمیری زبان نے بھی دوسری زبانوں کے اثرات قبول کیے ہیں۔ کشمیری زبان میں فارسی، عربی، ہندی اور مقامی زبانوں کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں جس کی عکاسی عزیز احمد نے اپنے ناول میں کی ہے۔ انگریزوں کی برصغیر میں آمد کے بعد کشمیری زبان نے انگریزی زبان کو بھی قبول کیے۔ کشمیری زبان میں بعض انگریزی زبان کے الفاظ کو کشمیری لہجے میں ادا کیا جاتا ہے مثلاً صاحب کو "صاب" کہنا، عزت کے لیے "ازارت" کا لفظ استعمال کرنا وغیرہ۔ دونوں ناول نگاروں نے کشمیری ثقافت کی عکاسی کرتے ہوئے کشمیری زبان کے ان الفاظ کا ذکر کیا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کے کئی الفاظ کشمیری زبان میں شامل ہو گے ہیں جس کے اثرات ناول "برف آشنا پرندے" میں نظر آتے ہیں۔ اب کشمیری زبان میں پورے پورے جملے انگریزی زبان کے نظر آتے ہیں۔ لوگ کشمیری لہجے کے علاوہ انگریزی لہجے میں بھی انگریزی کے الفاظ ادا کرتے ہیں۔

ثقافت کی رونمائی علاقے کے رسم و رواج سے بھی کی جاتی ہے۔ رسم و رواج کا انسانی زندگی میں عمل دخل ہوتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ انسانی زندگی کے ہر معاملہ میں رسم و رواج کے زیر اثر نظر آتا ہے۔ رسم و رواج میں علاقے کے مذہب کا تعلق ہوتا ہے کیونکہ رسم و رواج کو مذہب کے تحت ہی طے کیا جاتا ہے۔ ترنم ریاض اور عزیز احمد دونوں نے کشمیری رسم و رواج کا ذکر کیا ہے۔ جن میں شادی کی رسم و رواج قابل ذکر ہیں۔ شادی کی رسومات میں "عقد" کی رسم کو دونوں نے اہمیت دی ہے۔ ترنم ریاض نے عورتوں کی طرف کی جانے والی رسومات کا ذکر کیا ہے جس میں بارات کے استقبال کے لیے "بدائی" گائی جاتی ہے۔ ان بدائیوں میں بارات کے استقبال کے ساتھ ساتھ دلہن کو دعا دی جاتی ہے کہ وہ اپنے گھر میں ہمیشہ خوش و خرم رہے۔ ان بدائیوں کے الفاظ وقت کی مناسبت سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ جبکہ عزیز احمد نے مردوں کی طرف کی جانے والے رسومات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عقد کی رسم کے بعد اہم رسم "سلامی" کی ہوتی ہے۔ جس میں دولہے کو کچھ رقم دی جاتی ہے جو اس کے آنے والی زندگی کے مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ان رسومات کے بعد طعام کا انتظام کیا جاتا ہے جس کے بعد رخصتی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔

ترنم ریاض کے ہاں شادی کی رسومات کے ساتھ لوک گیتوں کا ذکر کیا گیا ہے جس میں عورتیں چار چار عورتوں کا ایک جنگلہ بناتی ہیں اور باری باری لوک گیتوں کو گاتی ہے۔ لوک گیت معاشرے کے رویوں کے عکاس ہوتے ہیں۔ یہ لوک ورثہ نسل در نسل منتقل کیا جاتا ہے۔

عزیز احمد نے شادی کی رسومات کے علاوہ "نوروز" کی رسم کا ذکر کیا ہے۔ یہ ہندومت میں اہمیت کی حامل ہے۔ یہ رسم پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش میں ہندومت سے تعلق رکھنے والوں کے لوگ بھی بڑی عقیدت واحترام کے ساتھ کرتے ہیں۔ "بسم اللہ" کی رسم بھی مسلم خاندانوں میں نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ "بسم اللہ" کی رسم بچے کے چار سا چار ماہ کے ہونے کے بعد ادا کی جاتی ہے جس میں خاندان کے بڑے بزرگ مل کر اس بچے کو دعا دیتے ہیں اور اس کے بعد با قاعدہ تعلیم کا آغاز کیا جاتا ہے۔ ترنم ریاض کے ہاں صرف شادی کی رسومات کا ذکر ہے جبکہ عزیز احمد نے شادی کے علاوہ مذہبی اور علاقائی رسومات کا بھی ذکر کیا ہے۔

ہر علاقے کے کچھ کھانے اس کی نمائندگی کرتے ہیں۔ علاقائی کھانے اس علاقے کے لوگوں کی ضروریات کو پوری کرنے کے ساتھ ساتھ اس علاقے کی پسند وناپسند کی پہچان ہوتے ہیں۔ کشمیری کھانے کشمیر کی ثقافت کے نمائندہ ہیں۔ کشمیر میں گوشت سے بنی ہوئی چیزوں کا استعمال زیادہ کیا جاتا ہے۔ جو اس کی غذائی ضرویات کو پورے کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو انرجی بھی فراہم کرتا ہے۔

کشمیر میں صبح کے کھانے میں گہیوں اور مکئی سے بنی ہوئی چیزوں کا استعمال کیا جاتا ہے جبکہ رات کے کھانے میں گوشت سے بنی ہوئی چیزوں کا استعمال زیادہ کیا جاتا ہے۔ دونوں ناولوں میں جہاں کہیں کھانے کا ذکر آیا ہے تو زیادہ تر گوشت سے بنی چیزیں ہی بیان ہوئی ہے۔ کشمیری چائے کشمیری ثقافت کی عکاس ہیں۔ یہ چائے پوری دنیا میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہے۔ لیکن وقت کے تنوع کی وجہ سے اس میں بھی تنوع آگیا ہے۔ اب کشمیری چائے میں سوڈا ملا کر پیا جاتا ہے۔ اس طرح کی چائے لکھنو میں پی جاتی تھی لیکن اب اس چائے کو کشمیر کی ثقافت میں بھی نمایاں مقام حاصل ہو رہا ہے۔

باقر خانیاں کشمیر کی سوغات میں سے ایک ہے جو کشمیری کھانوں کا مظہر ہے۔ پورے برصغیر میں باقر خانیاں بڑے شوق سے کھائی جاتی ہیں لیکن کشمیر میں اس کی بناوٹ کا انداز مختلف ہے۔ کشمیر میں اسے دم دے کر بنایا جاتا ہے

جبکہ ہر علاقے میں اسے گھی میں تلا جاتا ہے۔ کھانے بنانے کے طریقے بھی ہر علاقے کے اپنے ہوتے ہیں اس لیے ایک ہی کھانے کو کئی طریقوں سے بنایا جاتا ہے۔

لباس انسان کے جسم کو ڈھانپے کا ذریعہ ہے۔ ہر علاقے کے لوگ لباس کے انتخاب میں کچھ اصولوں کو مد نظر رکھتے ہیں۔ یہ اصول ثقافت کے متعین کردہ ہوتے ہیں ۔ کشمیر میں ثقافتی لباس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کشمیر میں بزرگ "شملا" یا "دستار" کا استعمال زیادہ کرتے ہیں۔ کشمیر میں شملا کو عزت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ مردوں میں زیادہ تر لوگ "چغہ "کا استعمال کرتے نظر آتے ہیں البتہ ثقافت میں تنوع کی وجہ سے اب کشمیر میں "چغہ " کے علاوہ شلوار قمیض بھی مرد پہنتے ہیں۔

عورتوں کے لیے کشمیری لباس "پھیرن" ہے جس کو مختلف طریقوں سے سجایا جاتا ہے۔ دونوں ناولوں میں عورتوں کے لباس میں "پھیرن" ہی دکھایا گیا ہے البتہ ترنم ریاض نے کشمیری ثقافتی تنوع کو بیان کرتے ہوئے عورتوں کے لباس میں بھی تنوع کو دیکھایا ہے اور اب کشمیر میں عورتیں کڑھی کی گئی شلوار قمیض کا استعمال بھی کرتی ہیں۔

زیورات عورتوں کی تزئین وآرائش کا ذریعہ ہے جو عورتوں کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ عزیز احمد نے زیورات کا ذکر کرتے ہوئے کشمیری زیورات کی بات کی ہے جسے ایک زمانے میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ہر سیاح کشمیر سے زیورات کو لے کر جاتے تھے۔ کشمیری زیورات کی اہمیت واضح کرتے ہوئے عزیز احمد نے لکھا ہے کہ یہ زیورات برطانیہ میں عورتیں خاص خاص موقعوں میں استعمال کرتی تھیں۔ یہ زیورات قیمتی پتھروں سے بنائے جاتے تھے۔ جن میں نیلم، یاقوت اور فیروزے کے پتھر شامل ہیں۔ یہ زیورات لداخ، تبت میں کثرت سے ملتے ہیں۔

مذہب ہر علاقے کی پہچان ہوتا ہے۔ ثقافت پر سب سے اثر انداز ہونے والے عوامل میں سے مذہب ایک ہے۔ جب بھی کوئی معاشرے کسی موضوع پر گفتگو کرتا ہے تو اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے مذہبی حوالہ دیتا ہے۔ یہاں تک کہ شادی اور موت کی رسومات بھی مذہب کے مطابق طے کی جاتی ہیں۔ ثقافت کی تشکیل میں مذہب کا کردار نہایت اہم کا حامل ہے۔ وقت کی تبدیلی کے ساتھ مذہب کے اثرات میں بھی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ جب بھی کوئی نیا مذہب کسی علاقے میں ظہور پذیر ہوتا ہے تو اس علاقے کی ثقافت میں تبدیلی رونما کرتا ہے۔

کشمیر میں سب سے پہلے بدھ مت کی آمد ہوئی جس کے اثرات کشمیری ثقافت میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ دونوں ناولوں میں بدھ مت کی آمد کی وضاحت کی گئی ہے۔ بدھ مت کے خاتمے کے ساتھ ہی ہندو مت کا آغاز ہوا۔ ہندو مت کے ہاں ہمالیہ کے پہاڑوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے عقیدے کے مطابق ہمالیہ کے پہاڑ ان کے دیوی دیوتاؤں کا مسکن ہیں۔ آج بھی پوری دنیا سے لوگ مذہبی ایام میں ہمالیہ کی پہاڑیوں کی طرف سفر کرتے ہیں۔ ہندو مت کے خاتمے کے ساتھ ہی ناگ دیو کے مذہب کا آغاز ہوا جس کا ذکر ترنم ریاض نے اپنے ناول میں کیا ہے۔ ۱۲ صدی میں اسلام کشمیر میں آیا۔ جس کے بعد پورے برصغیر میں اسلام کا پھیلاؤ کیا گیا ہے۔ ان مذہب کے تحت وقتاً فوقتاً ثقافت میں تبدیلی آتی رہی ہے۔ موجود دور میں ان تمام مذہب کے ثقافتی اثرات کشمیری ثقافت میں نظر آتے ہیں۔

مذہب کے ساتھ ہر علاقے میں کسی نہ کسی توہم پرستی کو جوڑا گیا ہوتا ہے جس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن فرد سے اس نظریے کو قائم رکھا ہوتا ہے۔ ان نظریات کو نہ صرف فرد مانتے ہیں بلکہ پورے اعتماد کے ساتھ ان پر قائم بھی رہتے ہیں۔ کشمیر میں چند توہمات موجود ہیں۔ جو نسل در نسل چلی آرہی ہیں۔ ان میں ایک توہم "بیساکھی" کے دن بارش کا ہونا ہے۔ ہندو مت میں یہ مانا جاتا ہے کہ بیساکھی کے دن بارش ضرور ہوتی ہے۔ اب یہ توہم پورے کشمیر میں مانی جاتی ہے۔ کشمیر کے لوگ "دیوان حافظ" کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ وہ اپنی قسمت کا حال اس کتاب سے معلوم کرتے ہیں۔ جس دن کوئی فال فائدہ مند نہ نکلے تو وہ اس دن کو منحوس سمجھتے ہیں اور اس وقت تک فعال نکالتے رہتے ہیں جب تک فال فائدہ مند نہ نکلے۔

ترنم ریاض نے ان دونوں توہمات کے علاوہ "راجہ گلاب" کی وفات پر بنائی جانے والی توہم کا ذکر کیا ہے۔ اس توہم کے مطابق کشمیر کے لوگوں کو مانا ہے کہ راجہ گلاب کی روح ایک مچھلی میں قید ہے جس کی وجہ سے وہاں کے راجہ نے کئی سالوں تک مچھلی کے شکار پر پابندی لگادی تھی۔ قحط کے دور میں یہ پابندی ختم کی گئی لیکن آج بھی لوگ اس توہم کی وجہ سے مچھلی کا شکار کم کرتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ان توہمات کا خاتما ہو رہا ہے لیکن ابھی بھی لوگ ان پر یقین کرتے ہیں اور ان کے مطابق اپنی زندگی بسر کرتے نظر آتے ہیں۔

انسان نے جب سے دنیا میں قدم رکھا ہے، وہ قدرت کے سامنے خود کو بے بس سمجھتا ہے۔ جیسے جیسے وقت بدلتا گیا انسان کو جس چیز نے فائدہ دیا وہ اس کو خدا ماننا شروع ہو گیا یا جس چیز سے خوف زدہ ہوا اسے کی پرتش شروع کر دی۔

اساطیر سے مراد وہ کہانیاں ہیں جن کا تعلق کہیں نہ کہیں مذہب سے ہوتا ہے۔ ان میں مافوق الفطرت عناصر کا پایا جانا معمولی بات ہے۔ اساطیر مذہب کی طرح علاقائی ثقافت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ کشمیر میں بھی دوسرے علاقوں کی طرح اساطیر پائی جاتی ہیں۔

کشمیر میں "دلر جھیل" کے بارے میں اساطیر پائی جاتی ہے۔ اس جھیل میں پانی کشیپ شی نے جنگ کرنے کے بعد چھوڑا تھا۔ پہلے یہ جھیل میدان کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ ترنم ریاض اور عزیز احمد دونوں نے اس اساطیر کے بارے میں لکھا ہے لیکن دونوں کی کہانیوں میں فرق ہے البتہ جنگ کے واقعات میں مماثلت پائی جاتی ہے۔

کشمیر میں "ناگ رائے" کی اساطیر بھی پائی جاتی ہے جو کشمیر میں "ناگ دیو" کے مذہب سے چلتی آ رہی ہے۔ اس اساطیر کے مطابق "ناگ رائے" نے کشمیر کی شہزادی سے محبت کی شادی کی تھی اور بعد میں انسان کی صورت اختیار کر کے کشمیر پر حکومت بھی کی۔

حاصل بحث یہ ہے کہ ترنم ریاض کے ناول "برف آشنا پرندے" اور عزیز احمد کے ناول "آگ" دونوں میں کشمیری ثقافت کو بیان کیا گیا ہے۔ عزیز احمد نے کشمیری ثقافت کی رونمائی ۱۹۴۶ء تک کی ہے جبکہ ترنم ریاض کا ناول ۲۰۰۹ء تک کا عکاس ہے۔ دونوں ناولوں میں بڑا فرق اشاعت کے زمانے کا ہے۔ تقریباً ۶۰ سال کے عرصے میں کئی واقعات نے کشمیری ثقافت کو متاثر کیا ہے جس کو ترنم ریاض نے بیان کیا ہے۔ عزیز احمد نے اس وقت کے کشمیر کو بیان کیا تھا جب مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر ایک ہی خطہ تھے جبکہ ترنم ریاض نے صرف مقبوضہ کشمیر کی ثقافت کو بیان کیا ہے۔ دونوں ناولوں کی ثقافت میں آزاد اور غلام ثقافت کا عکاس نظر آتا ہے۔ آزاد ثقافت ہمیشہ اپنے مقاصد اور نصب العین کے تحت ترقی کرتی ہے جبکہ غلام لوگوں کی ثقافت حاکم قوم کی ثقافت سے اثر لیتی ہے اور اپنے نصب العین کی بجائے حاکم قوم کے اثرات کے زیر اثر پروان چڑھتی ہے۔

ثقافت میں جغرافیائی عوامل بھی بہت حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔ عزیز احمد نے ایک بڑے خطے کی بات کی ہے جبکہ ترنم ریاض نے ایک مخصوص خطے کی بات کی ہے۔ عزیز احمد کے ہاں لباس، کھانے، مذہب، اساطیر، توہمات، زبان الغرض ہر چیز کی عکاسی میں مسلم ثقافت کے اثرات زیادہ نظر آتے ہیں جبکہ ترنم ریاض کے ہاں ثقافت کی عکاسی میں مسلم ثقافت کے اثرات کے ساتھ ہندو ثقافت کے اثرات کی جھلک کی بھی نظر آتی ہے۔ ان اثرات میں سب سے زیادہ

اثر انداز ہونے والا عوامل "زبان" ہے۔ ترنم ریاض نے کئی جملے ایسے ناول میں لکھے ہیں جو ہندی اور سنسکرت کے ہیں اور ہندو مت کی عکاسی کرتے ہیں جبکہ عزیز احمد ہندی زبان کے الفاظ لکھتے ہوئے بھی مسلم ثقافت کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔

تحقیقی نتائج:

ناول "آگ" اور "ناول "برف آشنا پرندے" کے ثقافتی مطالعے سے کشمیری ثقافت میں درج ذیل تنوعات سامنے آتے ہیں۔

- عزیز احمد کا ناول "آگ" ۱۹۴۶ء میں شائع کیا گیا جبکہ ترنم ریاض کا ناول "برف آشنا پرندے" ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا ہے۔ دونوں ناولوں کی اشاعت میں ۶۳ سال کا فرق ہے۔ اس عرصے میں ہونے والی تبدیلیوں نے ثقافت میں تنوع پیدا کیا ہے۔
- دونوں ناولوں میں کشمیری ثقافت کے مظاہر میں کشمیر کی تاریخ کو بیان کیا گیا ہے۔ عزیز احمد اور ترنم ریاض دونوں نے کشمیر کی تاریخ کا آغاز بدھ مت سے کیا ہے۔ بدھ مت کی تاریخ سے لے کر مسلمانوں کی آمد تک دونوں ناولوں میں ایک جیسی تاریخ ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کی تاریخ عزیز احمد نے وضاحت سے بیان کی ہے جبکہ ترنم ریاض نے ۱۹۴۷ء کے بعد کی تاریخ کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اس تاریخ میں اکیسوی صدی کے اثرات بھی شامل ہیں۔
- دونوں ناول نگاروں نے کشمیر کی خوبصورتی کو منفرد انداز میں بیان کیا ہے۔ ترنم ریاض نے ناول "برف آشنا پرندے" میں کشمیر کی خوبصورتی میں مقامی جھیلوں، چنار کے درختوں، موسم کے بدلنے اور برف باری کے ذریعے بیان کیا ہے۔
- عزیز احمد نے اپنے ناول "آگ" میں کشمیر کا جغرافیہ ۱۹۴۲ء تک کا بتایا ہے، اس وقت تک تقسیم برصغیر وجود میں نہیں آئی تھی جبکہ ترنم ریاض نے "برف آشنا پرندے" میں قیام پاکستان کے بعد کا جغرافیہ بیان کیا ہے۔ جو ۱۹۴۸ء کے بعد کا ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ بندی کے بعد کا جغرافیہ اس ناول میں دیکھا جا سکتا ہے۔ عزیز

احمد نے ناول میں کشمیری جغرافیہ کے بارے میں کچھ ایسے علاقوں کو بھی بیان کیا ہے جو اب پاکستان کی ریاست میں شامل ہیں۔

- عزیز احمد نے مسلمانوں کی بود و باش کی بات کی ہے جبکہ ترنم ریاض نے بدھ مت، مسلم اور انگریز تینوں کی طرز معاشرت کو بیان کیا ہے۔ عزیز احمد اور ترنم ریاض دونوں نے ثقافتی اشیاء کا ذکر کیا ہے۔ عزیز احمد نے مسلمانوں کی نمائندہ اشیاء جن میں فنون لطیفہ کی باز گذشت نظر آتی ہے کا ذکر کیا ہے جبکہ ترنم ریاض نے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ انگریزوں کی ثقافتی اشیاء کا بھی ذکر کیا ہے۔ عزیز احمد نے قالین بافی کی صنعت کو تفصیلاً بیان کیا ہے جبکہ ترنم ریاض اس صنعت کے ختم ہونے پر افسوس کا اظہار کرتی نظر آتی ہیں۔
- دونوں ناولوں میں کشمیری زبان کے ساتھ ساتھ مقامی زبان کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ عزیز احمد نے انگریزی زبان کے الفاظ کو کشمیری لہجے میں ادا کیا ہے جبکہ ترنم ریاض نے انگریزی زبان کا استعمال ناول میں زیادہ کیا ہے۔
- عزیز احمد اور ترنم ریاض دونوں نے رسوم و رواج کے متعلق کشمیری رسومات کا ذکر کیا ہے ترنم ریاض کے ہاں عورتوں میں ادا کی جانے والی رسومات کا ذکر تھا جبکہ عزیز احمد کے ہاں مردوں میں ادا کی جانے والی رسومات کا ذکر تھا۔ عزیز احمد نے "نوروز" اور "بسم اللہ" مذہبی رسومات کا ذکر کیا ہے جبکہ ترنم ریاض نے صرف شادی کی رسومات کا بیان کیا ہے باقی رسومات کو ناول کا موضوع نہیں بنایا۔
- ترنم ریاض نے لوک گیت کو ناول کا حصہ بنایا جبکہ عزیز احمد کے ہاں لوک گیت نظر نہیں آتے۔
- ترنم ریاض اور عزیز احمد دونوں نے مقامی کھانوں کا ذکر کیا ہے۔ جن میں ناشتے میں گیہوں سے بنی چیزیں جبکہ دن اور رات کے کھانے کے لیے گوشت سے بنی چیزیں شامل ہیں۔ مقامی کھانوں میں "باقرخانیوں" کا ذکر دونوں کے ہاں ملتا ہے۔ کشمیری ثقافت میں اہمیت رکھنے والی "کشمیری چائے" کے بارے میں دونوں نے بیان کیا۔
- ثقافتی لباس کا ذکر دونوں ناولوں میں موجود ہے۔ جن میں عورتوں کا لباس "پھیرن"، مردوں کا لباس "چغہ" اور "شملا" بھی شامل ہے۔ جن کی عکاسی دونوں ناولوں میں ہوئی ہے۔ ترنم ریاض نے جدید دور میں کشمیر میں پہنے جانے والے لباس کا ذکر بھی کیا ہے جو اب کشمیری ثقافت کا حصہ بن رہا ہے۔

- دونوں ناولوں میں کشمیر میں مذہب کا آغاز "بدھ مت" سے دیکھایا گیا ہے۔ عزیز احمد نے کشمیر کی ثقافت میں مذہب کے اثرات بیان کرتے ہوئے بدھ مت، ہندو مت اور اسلام تینوں مذاہب کا ذکر کیا ہے۔ جبکہ ترنم ریاض نے ان تین مذاہب کے ساتھ "ناگ کی پوجا" کے مذہب کو بھی بیان کیا ہے۔
- دونوں ناول نگاروں نے مذہبی توہمات پرستی کا ذکر کیا ہے۔ عزیز احمد نے "بیساکھی" اور "دیوان حافظ" کے متعلق توہمات کا ذکر کیا ہے جبکہ ترنم ریاض نے "راجہ گلاب" کے حوالے سے توہم پرستی کو بیان کیا ہے۔
- اساطیر ثقافت میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ترنم ریاض اور عزیز احمد دونوں نے کشمیری جھیلوں کے متعلق اساطیر کو بیان کیا ہے جن میں سب سے مشہور اساطیر "ستی سر" کی جھیل کی ہے جسے ہندو مت کے بانی "کشیپ شی" نے بنایا ہے۔ لیکن واقعات کا تسلسل دونوں کا مختلف ہے البتہ آغاز اور اختتام ایک جیسا ہے۔ دونوں ناولوں میں جو اساطیری کہانی بیان کی گئی ہے ان میں سے کچھ عناصر ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ عزیز احمد نے ناول میں صرف ایک ہی اساطیری کہانی بیان کی ہے جبکہ ترنم ریاض نے اس اساطیری کہانی کے علاوہ ایک اور کہانی جو ناگ دیوتا سے متعلق تھی وہ بھی بیان کی ہے۔

سفارشات:

"آگ" اور "برف آشنا پرندے" کے مطالعے کی بنیاد پر مندرجہ ذیل سفارشات کی جاتی ہیں:

- نو تاریخیت کے تناظر میں ناول "آگ" اور "برف آشنا پرندے" کا تقابل کسی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔
- عزیز احمد کے ناول کا کرشن چندر اور اے حمید کے ناولوں کے ساتھ ثقافتی تقابل کیا جاسکتا ہے۔
- معاصر اردو ناول میں ثقافتی عناصر کے حوالے سے تقابلی مطالعات کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں کشمیر کی ثقافت کا کسی دوسری ریاست کی ثقافت سے تقابل اردو ادب میں ایک بہترین اضافہ ہو گا۔
- یہ تحقیق ایک ریاست کے ماحول، تاریخ اور ثقافت پر مشتمل ہے، اس طرح کی مزید تحقیقات کی سفارش کی جاتی جو مختلف صوبوں اور ملکوں پر مشتمل ہونی چاہیئے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:

ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، بک کارپوریشن، دھلی، ۲۰۰۹ء

طاہر منصور فاروقی، مرتب: عزیز احمد کے چار ناول، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء

ثانوی ماخذ:

ابو سعید قریشی، پرانا قالین، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۹ء

اشتیاق احمد، کلچر: منتخب تنقیدی مضامین، بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۲۳ء

اعجاز حنیف، ڈاکٹر، عزیز احمد: شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء

انتخاب حمید، اردو کے نئے ناول صنفی وجمالیاتی منطق، کتابی دنیا، لاہور، ۲۰۲۳ء

انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء

اے۔ حمید، ڈاک بنگلہ، خالد بک ڈپو، لاہور، ۱۹۶۴ء

اے۔ حمید، اور چنار جلتے رہے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء

بیرن چارلز ہیوگل، سیاحت نامہ کشمیر و پنجاب، مترجم: محمد حسن صدیقی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۰

پیٹر بیری، پروفیسر، بنیادی تنقیدی تصورات، مترجم: الیاس بابر اعوان، عکس پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، ارسطو سے ایلیٹ تک، ایجوکیشنل پبلشنگ ھاوس، دہلی، ۱۹۷۷ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، مشتاق بک ڈپو، کراچی، ۱۹۶۴ء

چراغ حسن حسرت، کشمیر، کارگر پبلی کیشنز، دہلی، ۱۹۶۴ء

خاور جمیل، مرتب: ادب، کلچر اور مسائل، رائل بک کمپنی، صدر کراچی، ۱۹۸۶ء

خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، اردو مجلس، دہلی، ۱۹۹۴ء

روتھ بنٹی ڈکٹ، نقوش ثقافت، مترجم: سید قاسم محمود، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء،

رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ثقافت، اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۹ء

سید عبداللہ، ڈاکٹر، کلچر کا مسئلہ، علمی پرنٹنگ پریس، لاہور، اپریل، ۱۹۷۷ء

سلیم اختر، ڈاکٹر، ادب اور کلچر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء

شکیل الرحمن، زبان اور کلچر، بروکار پریس سرینگر، کشمیر، ۱۹۸۵ء

شکیل احمد خواجہ، مسئلہ کشمیر ایک تاریخی جائزہ، لاہور، کلیہ علوم اسلامیہ وشرقیہ پنجاب، یونیورسٹی، ۱۹۹۹ء

شمیم حنفی، ڈاکٹر، اردو کا تہذیبی تناظر اور معاصر تہذیبی صورت حال، شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، ۲۰۱۰ء

عائشہ بیگم، تاریخ اور سماجیات، ترقی اردو بیورو نئی دہلی، ۱۹۸۷ء

عفیفہ، ڈاکٹر، اردو ادب اور دہلی کی مشترکہ تہذیب، ایم۔ آر پبلیکیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۶ء

عکسی مفتی، پاکستانی ثقافت، الفیصل ناشر، لاہور، ۲۰۱۹ء

غلام علی الانا، ڈاکٹر، زبان اور ثقافت، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء

غلام عباس، ڈاکٹر، اردو تنقید اور پاکستانی کلچر کے مسائل، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا، ۲۰۱۷ء

فیض احمد فیض، ہماری قومی زبان، ادارہ یادگار غالب، کراچی، ۱۹۷۶ء

کرشن چندر، میری یادوں کا چنار، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۶۲ء

کرشن چندر، شکست، ساقی بک ڈپو، دہلی، ۱۹۴۳ء

محمد اسلم فاروقی، ڈاکٹر، عزیز احمد کی ناول نگاری کا تنقیدی مطالعہ، روشناس پرنٹرس ، دہلی، ۲۰۱۵ء

محمد الدین فوق، شاہی سیر کشمیر، اراکین مجلس ادبیات عالیہ، کشمیر، اکتوبر، ۲۰۲۰ء

محمد نعیم ورک، اردو ناول کا ثقافتی مطالعہ، کتاب محل، لاہور، ۲۰۱۹ء

مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، ثقافتی بشریات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء

نصیر احمد، ڈاکٹر، اسلامی ثقافت، فیروز سنز، س۔ن

نظر زیدی، سید، حبہ خاتون، مدینہ پریس، لاہور، ۱۹۵۸ء

وزیر آغا، کلچر کے خدوخال، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۹ء

وزیر آغا، معنی اور تناظر، انٹرنیشنل اردو پبلیکیشنز، دہلی، ۲۰۰۰ء

وزیر آغا، تخلیقی عمل، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، ۱۹۷۰ء

یوسف سرمت، بیسوی صدی میں اردو ناول، نیشنل بک ڈپو، حیدر آباد، دسمبر، ۱۹۷۳ء

رسائل / جرائد / اخبارات:

توسیف مجید لون، "کشمیر کی عکاسی ترنم ریاض کی تخلیقات "برف آشنا پرندے" اور "موتی" کے آئینے میں" (مضمون)، مطبوعہ: رفتار ادب، ۲۰۱۴ء، اردو ریسرچ جرنل

طاہرہ سرور، ڈاکٹر، "عزیز احمد کے ناول "آگ" کا تجزیاتی مطالعہ "(مضمون)، خیابان بہار، شمارہ:۳۸، ۲۰۱۸، جامعہ پشاور،

عطرت بتول، "معاصر اردو افسانے میں ثقافتی مغائرت کی عکاسی"، حرف و سخن، ۲۰۲۴ء

کرار حسین، پروفیسر، "پاکستانی کلچر اور اس کے مسائل" (مضمون) مشمولہ: نیادور، شمارہ ۴۷۔۴۸، کراچی، ۱۹۹۹ء

مکتوب:

عزیز احمد (مکتوب)، بنام چوہدری ریاض احمد، مطبوعہ: سویرا، سویرا پریس، لاہور، شمارہ:٦٧، س۔ن

ویب سائٹ:

https://www.humsub.com.pk,17November2024

https://www.urdulink.com.pk,15December2024

انگریزی کتب:

The culture of Kashmir,S.M.Iqbal,K.LNirash,Marwah publications,new Delhi,1978